

ویران گلی میں لڑکی

اے حمید

ویران گلی میں لڑکی

لاہور کی ایک تنگ و تاریک گلی میں بیٹھا امرتسر کے شریف پورے والے لائن پار کے امرود، ناشپاتی اور لوکاٹ کے باغوں، آم کے جھنڈوں میں سے ہو کر گزرتی ہوئی ٹھنڈی پرسکون نہروں، کمپنی باغ کے اونچے لمبے گھنے جامن کے درختوں اور موسلا دھار برسات میں بھیگتے ہوئے شہتوت کے پیڑوں اور چھوٹی نہر میں پکی پلیا پر سے کودتے ہوئی ننگ دھڑنگ بچوں کا ذکر کرنے لگا ہوں۔

یہ اہرام اتنا پرانا نہیں ہے، لیکن اس کی کھدائی کرتے ہوئے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ مصر کے بادشاہوں سے بھی پہلے کا ہے۔ ہر دفعہ بیلچہ سو سال کی مٹی ہٹا کر پھینک رہا ہے۔ کل کی بات ہے کہ میں نے اس جگہ ایک بڑی خوبصورت آہو چشم شہزادی کو جوڑے میں آلوچے کے شگوفے لگا کر اپنے ہاتھوں دفن کیا تھا۔ مگر آج اس کے حسین ترین جسم کے نازک خطوط مٹی پر کھنچی ہوئی لکیریں بن گئے ہیں۔ گوشت گل سڑ گیا ہے اور ہڈیاں چورا ہو گئی ہیں۔ کل اس شہزادی کے شہد بھرے ہونٹوں پر مسرت کی پراسرار سرگوشیاں تھیں اور آج ان سرگوشیوں کی بازگشت تک سنائی نہیں دیتی۔ زندگی کے خون سے دھڑکتے ہوئے گرم، آبدار، چمکیلے شبنمی ہونٹ گہرے تاریک سکوت کے ذرات بن کر فضا میں منتشر ہو گئے۔ آنکھیں راستوں پر لگی ہیں، کان آواز پر لگے ہیں۔ ہمہ تن چشم ہیں، ہمہ تن گوش ہیں۔ لیکن کوئی صدا نہیں۔ کوئی چاپ نہیں۔ راستوں پر گرد بھی نہیں اڑ رہی۔ خلاؤں میں ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی۔ یہ زندگی اور موت کے درمیان کا وقفہ ہے۔ یہاں زندگی ختم ہو جاتی ہے مگر موت شروع نہیں ہوتی۔

میں اپنی آہو چشم، چمکیلی آنکھوں اور گرم دھڑکتی آبنوسی چھاتیوں اور شبنمی ہونٹوں والی شہزادی کی ہڈیوں کو محکمہ آثار قدیمہ والوں کے سپرد نہیں کروں گا۔ میں اپنی بچھڑی ہوئی مسرت کی لاش کو عجائب گھر کی الماریوں میں بند نہیں کروں گا۔ جہاں کوئی اس کا سرد لمس بھی محسوس نہ کر سکے۔ میں ایک بار پھر اس کی بے حرمتی کے جرم کا مرتکب نہیں ہونگا۔

داغ ہیں جو بہنوں کو بچانے، ماؤں کو بچانے، بیٹوں کو بچانے اور اپنے آپ کو بچانے کیلئے موت کی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ہونٹوں سے بلند ہوئیں اور جو بہرے کانوں، دل کے پتھروں اور آسمان کے گنبد سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔ یہ اس ماں کی خون آلود چھاتی ہے جو اپنے بیٹے کو دودھ نہ پلا سکی۔ یہ اس بیٹے کے آنسو ہیں جو اپنی ماں کی قبر پر نہ بہائے جا سکے۔ یہ اس بہن کا دوپٹہ ہے جو بھائی کے سامنے اس کے سر پر سے کھینچا گیا۔ یہ اس بیوی کا مقدس دامن ہے جو اس کے خاوند کی آنکھوں کے سامنے تار تار کر دیا گیا۔ یہ وہ نقاب ہے جو کبھی آنکھوں سے نہ اٹھتا تھا لیکن پھر لوگ اسے جگہ جگہ اٹھائے لئے پھرے۔

میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے اس سورمے کی موت پر ماتم کناں ہوں جو اپنی ہی کمان سے نکلے ہوئے تیر سے ہلاک ہو گیا۔ اس سہراب کی لاش پر آنسو بہا رہا ہوں جسے اپنے ہی باپ کے خنجر نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ جس کا مردہ جسم خاک اڑاتے میدان میں پڑا چیل کوؤں کی غذا بن گیا، جسے لحد کی آغوش بھی نصیب نہ ہو سکی۔ جس کے جنازے پر کوئی توپ سر نہ کی گئی، کوئی جھنڈا سرنگوں نہ ہوا، کسی فوج نے سلامی نہ دی اور جس کے مرقد پر کوئی دیا نہ جل سکا، کوئی گنبد نہ بن سکا۔ یہ وہ لاڈلا ہے جسے اس کی ماں کی سوکن نے دریا میں دھکا دے دیا۔ غم نصیب ماں نے دریا کنارے جھونپڑا ڈال لیا ہے۔ وہ صبح و شام وہاں بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے پانی کی لہروں کو تکتی رہتی ہے جو اس کے بیٹے کو نگلنے کے بعد خاموش ہو گئی ہیں۔ جیسے ایک روز دریا اسے اس کا بیٹا واپس کر دے گا۔ طوفان آتا ہے، بادل گرجتے ہیں بجلی کڑکتی ہے چھاجوں پانی برستا ہے مگر غم زدہ ماں اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔

لیکن اب اگر مشرق کی سمت نظر کریں تو صبح کا جھلملاتا ہوا ستارہ، طلوع ہوتی سحر کے اولین حسن کار اجالوں میں ماند پڑتا جا رہا ہے۔ آسمان پر نیلگوں روشنی کا پھیکا سا غبار پھیل رہا ہے۔ رات بھر کے تھکے ماندے بیمار اندھیرے ہزیمت خوردہ سپاہیوں کی طرح سر جھکائے شہر پناہ کے دروازوں سے باہر نکلنے لگے ہیں۔

شریف پورے والی مسجد میں ابھی ابھی اذان ہوئی ہے نمازی ٹونٹیاں کھولے وضو کر رہے ہیں۔ ان کے کھنکارنے اور کلی کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ گلی کوچوں میں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا چل نکلی ہے۔ اس ہوا میں شبنم کی تروتازگی اور لائن پار والے امرود کے باغوں کے سبزے کی مہک ہے۔ چوک بھائی صاحب اور رانی بازار کی

دکانیں کھلنا شروع ہو گئی ہیں۔

غلام رسول پنساری اپنی دکان کے کواڑ کھولے سڑک پر پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہے اور بلند آواز میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا ہے۔

خواجہ قاند رو یعنی نانبائی نے منہ اندھیرے ہی سے تنور میں لکڑی کے بڑے بڑے کندے جلا رکھے تھے۔ اس کا کاریگر تختے پر بڑی تیزی کے ساتھ میدے کے پیڑے بنا بنا کر قطار میں لگائے جا رہا ہے۔ ابھی خواجہ تنور پر جھک کر اندر گیلا کپڑا پھیرے گا، دائیں بازو پر گاڑھے کی میلی کچیلی آستیں چڑھائے گا اور قلچے لگانا شروع کر دے گا۔ قمر دین گارڈ کی چھوٹی لڑکی رومال گود میں لئے ابھی سے باہر تخت پوش پر آن بیٹھی ہے اور اونگھ رہی ہے۔

مسلم سکول کی طرف والی گلیوں میں سے اک تارے والے فقیر کی صدا سنائی دینے لگی ہے۔ یہ فقیر ہر روز صبح کو آتا ہے۔ کپڑے اس کے بڑے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ مجھے تو کوئی کسان لگتا ہے جس نے محنت سے جی چرا کر اک تارے پر گا کر مانگنے کا دھندا اختیار کر لیا ہو۔ ویسے اس کی آواز میں درد ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی گایا کرتا ہے۔

تینوں چھڈ کے کلی نوں ٹر گیاں

جناں داماں کریں۔

(تجھے جن پر بڑا مان تھا وہ تو تجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں!)

میں اس فقیر کی آواز سن کر بڑا اداس ہو جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ راجہ بھرتری ہری کی طرح اپنا گھر چھوڑ کر بن باس لے لوں۔ مگر شریف پورے والا ہمارا گھر اتنا پیارا ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس گھر کی گلی والی نشست گاہ میں نیلے رنگ کی موٹی اور پرانی دری بچھی ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہے۔ دیوار کے ساتھ بغیر شیشے کی ایک اونچی لمبی الماری ہے، جس کا براؤن رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس الماری میں میری بڑی اور چھوٹی بہنوں کی پرانی کتابیں، ایک ٹوٹا ہوا ٹائم پیس، سردیوں میں استعمال ہونے والے گرم سویٹر، بوسیدہ نواڑ کا ایک گول چکر اور دنیا جہان کی الابلا چیزیں بند پڑی ہیں۔ کونے میں ایک لمبا چوڑا میز ہے جس پر سنگر کی ایک مشین، شیشے کا ٹوٹا ہوا قلمدان، روزنامہ زمیندار اخبار کا پلندہ اور شطرنج کا ڈبہ پڑا ہے۔ دیوار پر فریم میں لگے ہوئے بڑے خوبصورت قطعوں کی قطار لگی ہے جن میں کہیں مکہ معظمہ کی تصویر ہے تو کہیں اللہ تعالیٰ کے اسمائے توصیفی لکھے ہیں۔

یہاں میری بہنیں اور بھابھیاں گرمیوں کی دوپہر میں بیٹھی بچوں کے فراک سیتی ہیں، دنیا جہاں کی باتیں کرتی ہیں اور پھر وہیں پڑ کر سو رہتی ہیں۔

مکان کی دوسری اور تیسری منزلوں پر میری دونوں بھابیوں اور بہنوں کا قبضہ ہے۔

میری دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ دو بڑی بہنیں پڑھائی ختم کرنے کے بعد گھر پر ہی سلائی وغیرہ کا کام سیکھ رہی ہیں۔ مسعودہ کی منگنی ہو چکی ہے۔ والد صاحب اچھی خاصی عمر کے ہیں لیکن صبح سے شام تک کام میں لگے رہتے ہیں۔ وہ کشمیری شالوں (جنہیں ہم کشمیری اپنی زبان میں فردیں کہتے ہیں) کی آڑھت کا دھندا کرتے ہیں۔ دوسری منزل میں بائیں طرف والی چھوٹی سی شہ نشین میرے پاس ہے۔ اس شہ نشین کی کھڑکی پہلو میں سے ہو کر گزرنے والی گلی کی طرف کھلتی ہے۔

شہ نشین تنگ سی ہے۔ بمشکل ایک پلنگ بچھ سکا ہے۔ جو جگہ بچ رہی ہے وہاں میں نے ایک چھوٹا گول میز ڈال دیا ہے جس پر کچھ رسالے اور کتابیں پڑی ہیں۔ چھت سے ایک چھوٹا سا پنکھا لگا ہے۔ سردیوں میں یہیں سوتا ہوں اور گرمیوں میں بھی اکثر دوپہر کا وقت اسی شہ نشیں میں گزرتا ہے۔

ایف اے سے بھاگ جانے کے بعد میں اکثر بیکار رہتا ہوں۔ والد صاحب نے شالوں کی آڑھت میں لگانا چاہا لیکن وہاں سے میں اٹھ دوڑا۔ نوکری کر کے چھوڑ دینا میرا من پسند مشغلہ ہے۔ میری اس سیلانی پنے کی وجہ سے والد صاحب مجھ سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ میں بھی ان سے بات کرنی پسند نہیں کرتا۔ بھائی اور بہنیں مجھ سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ ان سے جو جی میں آتا ہے رکھوا لیتا ہوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر کمپنی باغ کے کرسٹل ہوٹل یا شریف پوری کے باہر والے شاہ جہاں ہوٹل میں خوب چائے پیسٹری اڑاتا ہوں۔

میری آوارہ گردیوں کے باوجود والد صاحب پوری طرح مجھ سے ناامید نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک نہ ایک دن میں ضرور اپنے آبائی کام میں جت جاؤں گا۔ چنانچہ وہ کبھی کبھی جب مال لے کر کلکتے بنارس یا لکھنؤ جاتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہ مجھے ہر کاروباری سے ملواتے ہیں۔ ہر سودا میرے سامنے طے کرتے ہیں۔ مجھے مارکیٹ کی اونچ نیچ اور کاروباری رموز سے پوری طرح باخبر رکھتے ہیں۔ میں ان باتوں کو بڑے

غور سے اور بڑی بے دلی سے سنتا ہوں اور خوبصورت شہروں کی خوب سیریں کر کے ویسے کا ویسا ہی لوٹ آتا ہوں۔ اگر دل و دماغ میں کچھ ہوتا ہے تو امین آباد یا گومتی کنارے دیکھی ہوئی کسی لکھنوی لڑکی کی مسکراہٹ یا کسی خوبصورت بنگالن کی اُداس آنکھیں، جسے دھرم تلہ کو لوٹولہ یا چورنگی کے بازار میں سے گزرتے ایک نظر دیکھا ہو۔ دل میں یہ خیال برابر رہتا ہے کہ کب والد صاحب مال لے کر سوداگری کو نکلیں اور ان دیوداسیوں کے دوبارہ درشن ہوں۔

2

اب دن نکلنے کو ہے۔

والد صاحب اور بڑے بھائی دونوں مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے چل دیئے ہیں۔ مسعودہ نے باورچی خانے میں سبز چائے کا پانی رکھ دیا ہے اور خود کمروں کی جھاڑ پھونک میں لگ گئی ہے۔ دوسری کلثوم نماز سے فارغ ہو کر قرآن کریم کی تلاوت کر رہی ہے۔ بھابی نے اوپر سے مجھے آواز دی کہ میں بازار سے انھیں دہی لادوں کیونکہ جیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مگر میں سنی ان سنی کر کے اپنے سیر والے ربڑ کے جوتے پہن کر شہ نشین کے جنگلے پر جھک کر سعید کا انتظار کر رہا ہوں۔ سعید میرا گہرا دوست ہے جو ریلوے میں ملازم ہے اور کٹڑہ مان سنگھ میں رہتا ہے۔ وہ ہر صبح سویرے سائیکل لے کر میرے ہاں آتا ہے اور پھر ہم دونوں سیر کے لئے گھر سے نکل جاتے ہیں۔

ابھی مجھے جنگلے سے لگ کر کھڑے چند لمحے گزرے تھے کہ سعید کے سائیکل کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے گلی میں آ گیا۔ میں نے سعید کا سائیکل اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں رکھا اور ہم باتیں کرتے سیر کے لئے چل پڑے۔

تحصیل پورے کی غیر مسلم آبادی بھی بیدار ہو گئی تھی۔ ہندو لالے رام نام کا جپ کرتے دکانوں میں لوبان سلگا رہے تھے اور باہر چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ ایک سکھ کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھا مسواک کر رہا تھا۔ دو سکھ حوضی کی ٹوٹنیاں کھولے نہا رہے تھے اور زبان سے گرونانک جی کی بانیاں پڑھتے جاتے تھے۔ تحصیل پور سے جب ریلوے لائن کی طرف چلیں تو ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر ان پھولوں کی چادر بچھ جاتی ہے اور سارا راستہ ان کی تر و تازہ اور ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے (اب اس جگہ ہندو سکھ مہاجروں نے مکان بنوا لئے ہیں اور اس جنت نشان پگڈنڈی کا سراغ بھی نہیں ملتا) اس کی ایک جانب تو ناخوں کا باغ تھا اور دوسری جانب لوکاٹ کے درختوں کا ذخیرہ تھا۔ لوکاٹ کے ان درختوں کے نیچے ہمیشہ کچھ لوگ زمین میں نکلے گاڑے لمبی تانی کھینچے سوت بٹ رہے ہوتے اور ناشپاتی کے باغ میں رکھوالوں نے اپنی چھوٹی سی جھونپڑی ڈال رکھی ہوتی۔ جھونپڑی کے سامنے مٹی کا چھوٹا سا گڑھا پڑا ہوتا اور دو ایک ننگ دھڑنگ بچے گوپیا میں گھما کر جانوروں پر پھینکنے والی گولیاں بنا رہے ہوتے۔ بچپن میں جب کبھی ہم باغوں میں امرود یا ناشپاتیاں توڑتے ہوئے پکڑے

جاتے تو رکھوالے ہم سے پانچ پانچ درجن گولیاں بنوا کر چھوڑ دیتے۔ لیکن ہم نے بھی رکھوالوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ باقاعدہ چھوٹی سی فوج بنا کر ان باغات پر حملہ کرتے اور کچے پکے پھل جھولیاں بھر بھر کر لاتے۔ ہم نے قسم کھا رکھی ہوتی کہ آم، لوکاٹ، آلوچے، ناشپاتی اور امرود کبھی خرید کر نہیں کھائیں گے۔ امرودوں کے باغ اس قدر وسیع تھے کہ ہم درختوں کے درخت اجاڑ دیتے اور رکھوالے کو خبر نہ ہوتی۔

تحصیل پورے کی اس خوشبودار پگ ڈنڈی سے ہو کر ہم ریلوے لائن پر آئے تو پانچ پچیس پر امرتسر پہنچنے والی بمبئے ایکسپریس شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ دور کہیں گھنے درختوں کے عقب میں سورج طلوع ہوچکا تھا جس کی زر تار روشنی کا سنہری جال آسمان پر تن گیا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے سنہری ہو کر کانپنے لگے تھے۔ لائن پار بالکل سامنے حکیم والی مسجد کے دودھیا میناروں کے کلس چمک رہے تھے۔ کنوئیں کی چرخی برابر چل رہی تھی۔ ہم دونوں دوست اس مسجد کے برابر سے گزر کر دائیں جانب سے ہو کر پودینے اور پیاز کے کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے اوپر ہنسلی پر چڑھ آئے۔ یہ ہنسلی زمین سے دس بارہ فٹ بلند ایک کچا راستہ تھا۔ یہاں سے نہر کا پانی زمین کے اندر ہوتا امرتسر کے دربار صاحب والے تالاب کو جاتا تھا۔ ہنسلی کی ایک جانب تو دیسی سخت ناخوں کے اونچے اونچے درخت تھے اور دوسری طرف لوکاٹ کے باغ پرلی جانب پٹھانکوٹ کو جانے والی ریلوے لائن کے ساتھ جا ملتا تھا۔

اس خوشگوار راستے پر کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک نہر آگئی۔ یہ نہر یہاں سے کمپنی باغ کی طرف مڑ گئی تھی۔ نہر کا پانی اسی مقام سے دربار صاحب کو جانے والی زمین دوز ہنسلی میں گرتا تھا جس کے دہانے پر لوہے کی مظبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک جگہ نہر کے کنارے کو تنگ کر کے پختہ چبوترے سے بنا دیئے گئے تھے۔ اس جگہ پانی ایک چھوٹی سی آبشار کی شکل میں نیچے گرتا تھا۔ یہ نہر دومونہی یعنی دومنہ والی نہر کے نام سے مشہور تھی۔ کیونکہ اس کا ایک رخ تو کمپنی باغ کی طرف تھا اور دوسرا زمین دوز ہنسلی کی طرف۔ نہر زیادہ چوڑی نہیں تھی اور صرف آبشار کے پاس جسے ہم اپنی زبان میں ٹھوکر کہتے ہیں صرف ایک مرد گہری تھی۔ آگے چل کر پانی صرف کمر تک ہی آتا تھا۔ اس نہر میں میں بچپن سے لے کر جوانی تک اس قدر نہایا ہوں کہ اس کے پانی کی تازگی اور اس کے کناروں پر اگی ہوئی نازک گھاس کی خوشبو ابھی تک میرے جسم میں محفوظ ہے۔

نہر کے پل سے ذرا آگے جا کر برگد کا ایک گنجان درخت تھا جس کے پاس ہی ایک

مندر تھا۔ مندر کے عقب میں اکھاڑہ تھا اور باہر ورزش کرنے کا سامان پڑا رہتا تھا۔ میں اور سعید یہیں آ کر خوب ورزش کرتے۔ جب بدن پسینے میں شرابور ہو جاتا تو پھلاہی کی مسواک کاٹ کر دانت صاف کرتے۔ نہر کے پل پر پاؤں پانی میں لٹکا کر بیٹھ جاتے اور صبح کی تازہ ہوا میں پسینہ سکھاتے۔ پھر وہیں سے نہر میں کود جاتے۔ نہر میں جی بھر کر نہاتے اور جب تھک جاتے تو انہیں درختوں، باغوں، پھولوں اور کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے واپس اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔

تیسرے پہر ہم ریلوے پھاٹک کے پار والی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتے۔ ہماری کرکٹ کلب میں بازار مائی سیواں اور جلیانوالہ باغ کے کچھ ہندو لڑکے بھی شامل تھے. اس گراؤنڈ میں مغلوں کے وقت کی ایک پرانی عمارت تھی جو اب کھنڈر بن چکی تھی۔ اس کی چھتیں ڈھے گئی تھیں اور دیواریں بارشوں کی وجہ سے سیاہ ہو گئی تھیں۔ شام کو اس کھنڈر میں سے چمگادڑوں کے غول نکلا کرتے تھے۔

اسی کھنڈر کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شام میں نے ثریا کو بتایا کہ اس میں بھوت رہتے ہیں تو وہ ڈر گئی تھی اور میرے بالکل ساتھ لگ گئی تھی. یہاں سے ذرا آگے نہر کی پٹڑی سے اتر کر ایک اجڑے ہوئے ٹیوب ویل کا ٹوٹا پھوٹا سا کمرا سا تھا جس کی کھڑکیوں کی چوکھٹیں لوگ اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ یہاں کسی نے شیشم کے درخت کا ایک بڑا سا کندہ کاٹ کر ڈال رکھا تھا۔ ہم دونوں اس کندے پر کتنی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

ثریا کو میں نے پہلی بار اپنی بڑی بہن مسعودہ کی شادی پر اپنے گھر پر دیکھا۔ مسعودہ کی منگنی جن دنوں ہوئی میں امرتسر میں نہیں تھا۔ بلکہ لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ اس کی نسبت بٹالے کے ایک کشمیری گھرانے میں طے پائی تھی. لڑکا کراچی میں درآمد برآمد کا کاروبار کرتا تھا۔ باپ محکمہ مال کا ریٹائر سپرنٹنڈنٹ تھا جو بٹالے میں اپنے کنبے کے ساتھ رہائش پزیر تھا۔

شادی نومبر کے شروع میں ہوئی۔

اس زمانے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر بڑی سجاوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ لڑکی والے نہ صرف گھر کو سجاتے بلکہ گلی میں بھی جھنڈیوں اور پھول پتوں کی چھت ڈال دیتے۔ ہماری گلی بھی خوب آراستہ کی گئی۔ دروازے پر کیلے کے دو درخت لگا دیئے گئے۔ ساری گلی گھر تک پتوں اور جھنڈیوں سے خوب سجا دی گئی۔ پہلو والی گلی میں دیگیں چڑھا دی گئیں۔ ہاتھ دھونے کے لئے حمام اور اسکی ٹونٹی کے عین نیچے پانی کے چھینٹوں سے بچنے کے لئے

ٹوکری میں پھوس بھر رکھ دیا گیا۔ نائی اپنے شاگرد کے ساتھ پیاز لہسن چھیلنے لگا۔ بیٹھک کا کمرہ سامان ایک طرف کر کے تقریباً خالی کر دیا گیا اور وہاں ایک لمبی چوڑی دری سر بہ سر بچھا دی گئی۔ سفید چاندنیوں پر گاؤ تکیے لگا دیئے گئے۔ دیواروں پر گرم شالیں لٹکا دی گئیں۔ کمرے کا رنگ روپ نکل آیا۔

گیارہ بجے برات آئی اور رخصتی رات آٹھ بجے ہو گئی۔

چھ سات گھنٹے گھر میں بلکہ پوری گلی میں خوب ہنگامہ رہا۔ لنگڑے لولے فقیروں نے لڑکے کے باپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس سے من چاہی رقم رکھوا نہ لی۔ ایک گرزمار گلی کے عین درمیان میں کھڑا ہو گیا اور لوہے کی ایک لمبی سی نوکیلی سلاخ اوپر اٹھا کر نعرہ زن ہوا۔

"اگر مجھے پانچ روپے نہ ملے تو سب کے سامنے یہ سلاخ اپنے پیٹ میں گھونپ لوں گا۔"

پہلے تو کسی نے پروا نہ کی لیکن جب اس ستم شعار نے سلاخ کا چوتھا حصہ پیٹ میں گھسیڑ لیا تو اسے مجبوراً پانچ روپے دینے پڑے۔ اس کے ایک دوسرے ساتھی نے دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر لہو لہان کر لیا اور چار روپے لے کر ٹلا۔ غرض کہ ان دنوں ایسے ہی فقیروں کی ٹولیاں آیا کرتی تھیں۔ اب یہ لوگ ناپید ہو گئے ہیں۔ یا انہوں نے یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا دھندا اختیار کر لیا ہے۔

دُولہا مجھے ذرا پسند نہ آیا۔ اس کا ناک بالکل طوطے ایسا تھا اور چوڑے چوڑے جبڑوں کے اوپر ریٹھا سی دو آنکھیں بڑی تیزی سے اپنے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ صاحب موصوف کا سر درمیان سے بالکل گنجا تھا۔ مجھے مسعودہ پر ترس آنے لگا جو بالکل جاپانی گڑیا ایسی پیاری تھی۔

رخصتی سے پہلے جب دولہا میاں کو چھیڑ خانی یا دلہن کی منہ دکھائی کے لئے اوپر لڑکیوں میں لایا گیا تو وہ پتھر کا بن کر بیٹھا رہا اور مذاق کرنے والی لڑکیوں کو ہر بات کا جواب ایسی سرد مہری سے دیا کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ قرآن اس کے سامنے کھول کر رکھا گیا تو وہ پرانے حافظ قرآن کی طرح فرفر پڑھ گیا۔ دودھ پلاتے وقت مسعودہ کا گھونگھٹ اٹھا کر اس نے اس طرح دودھ کا گلاس تھمایا جیسے کوئی کاروباری اپنا چرمی تھیلہ کھول کر اس میں سے چٹھیاں نکال کر ڈاک کے بھبکے میں ڈالتا ہے۔ مجھے ان ذات شریف سے نفرت ہو گئی۔ پلاؤ بریانی

آپ نے خوب ڈٹ کر کھائی اور ان کے چوڑے چوڑے جبڑے ہر نوالے کے ساتھ چکی کے پاٹوں کی طرح گردش کرتے رہے۔

بارات کے ساتھ عورتوں کی ایک ٹولی بھی آئی تھی۔ اس ٹولی میں لڑکے کی ماں، بہنیں اور دور کی دو ایک عورتیں شامل تھیں۔ جب بارات ادھر دیوان خانے میں بیٹھ گئی تو عورتوں کی یہ منڈلی زیورات اور دلہن کے لئے لائے ہوئے جوڑوں کا صندوق اٹھوائے گھر میں داخل ہوئی۔ ان میں ایک لڑکی جب سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اس کا پاؤں ذرا سا پھسل گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار "ہائے اللہ" نکل گیا۔ میں باقر خانیوں کی سینی اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس لڑکی کو ہاتھ سے سنبھالا دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرما گئی اور اس نے فوراً نقاب الٹ دیا۔ اس لڑکی کا رنگ سانولا اور آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں۔ اس نے سبز رنگ کے نشے کا سوٹ پہن رکھا تھا اور کانوں میں سونے کے جڑاؤ بندے جھلملا رہے تھے۔ جب میں نے ایک ہاتھ سے اس کے زم اور گداز بازو کو مضبوطی سے تھاما تو اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا اور شربتی آنکھوں میں حجاب کی لہر سی دوڑ گئی۔ اب میں کسی نہ کسی بہانے بار بار اوپر عورتوں میں جانے لگا۔ کبھی پانی پینے والے گلاس لینے، کبھی جگ لینے، کبھی دسترخوان اور کبھی یونہی صابن کی فالتو رکھی ہوئی ٹکیا لینے کے بہانے۔ اس دوران میں اس لڑکی کے ہر بار درشن کرتا۔ جب میں دوسری یا تیسری بار بہانہ بنا کر ادھر عورتوں میں آیا تو اس لڑکی کو شک ہوا۔ ہماری نگاہیں ملیں تو میں ذرا سا مسکرا دیا وہ گھبرا گئی اور اس نے سر پر دوپٹہ ٹھیک کر کے منہ دوسری طرف کر لیا۔

اب ہر دفعہ جب میں اوپر جاتا تو وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھنے کی کوشش کرتی۔ جب میرا دھیان کسی اور طرف ہوتا تو وہ نظریں بچا کر مجھے دیکھتی رہتی اور جب ہماری نگاہیں چار ہوتیں تو فوراً نظریں پھیر لیتی۔ ایک بار جب میں نے اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پکڑ لیا تو وہ فوراً مسکرا دی اور سر جھکا دیا۔

میرے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے منہ اندھیرے کی ٹھنڈی اور شبنم سے لدی ہوئی ہوا میں گلاب کے شگوفے نے اپنی پنکھڑیاں کھول دی ہوں۔ جیسے گھرے سرخ شیریں اناروں سے لدی پھندی ٹہنیاں جھک کر اپنا پھل پیش کر رہی ہوں۔ میں اس قسم کی پہلی نظر کی افلاطونی محبت کا اب قائل نہیں ہوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے اس قسم کی محبت کا معجزہ ہو جایا کرتا تھا۔ حصول آزادی کے لئے

دونوں طرف کے لوگوں کو جہاں خون اور آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں سے گزرنا پڑا ہے وہاں اس قسم کی پرانی محبتوں کا سارا ملمع اتر کر رہ گیا ہے۔ اب تو آدمی شادی بھی کرے تو اس عورت سے مشکل ہی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پہلی نظر کی محبت کا تو اب سوال ہی نہیں رہا۔ پہلے لوگ عورتوں کو دیکھا کرتے تھے اور بہت کچھ نظر آجاتا تھا اور خود بخود محبت ہوجاتی تھی۔ لیکن اب ہم عورتوں کو دیکھنے کی بجائے ٹٹولتے ہیں اور جب اندر سے کچھ نہیں نکلتا تو ایک سے دل برداشتہ ہو کر دوسری عورت کی طرف اٹھ دوڑتے ہیں اور یوں ہم ہر منزل پر دھوکا کھاتے، اور دھوکا دیتے کسی نہ معلوم منزل کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری حالت تو اس چور کی سی ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کسی مکان میں سیندھ لگائے اور اندر جا کر اسے معلوم ہو کہ مکان تو خالی پڑا ہے۔

میں تب کا ذکر کر رہا ہوں جب نگاہیں محبت، پاکیزگی اور تجدید حیا کا پیا دیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ثریا سے محبت ہوگئی۔ اس لڑکی کا نام ثریا تھا۔ ثریا کے نام میں ان دنوں بڑی کشش ہوا کرتی تھی کیونکہ ابھی توشی، زوشی، روشی اور نائلہ قسم کے ناموں کے اینگلو پاکستانی جزیرے دریافت نہیں ہوئے تھے۔ ابھی خطرناک حد تک چست قمیض پہننے اور دوپٹوں کے رسے گلے میں لٹکانے کا رواج نہیں چلا تھا۔

ان دنوں جو امریکن وائل اور کریپ ملا کرتی تھی اس کا رنگ دس بار دھوبی کے ہاں جانے کے باوجود بھی بگڑتا نہیں تھا۔ دراصل یہ اس عہد کے کردار کی پختگی تھی جو کپڑوں سے لے کر انسانوں تک میں موجود تھی۔ ہر انسان کا ایک نصب العین ہوتا تھا، جس کے لئے وہ محبت کرتا تھا، جدوجہد کرتا تھا۔ اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ دیا کہیں جل رہا ہے تو روشنی کہیں ہو رہی ہے اور پروانے کہیں جل بجھ رہے ہیں۔ یہ کوئی سو سال پہلے کی بات نہیں۔ صرف بارہ سال پہلے کا ذکر ہے۔ اس بارہ سال میں ہم پوری ایک صدی کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اتنی قلیل سی مدت میں جوان بوڑھے ہوگئے ہیں اور بوڑھے مر کھپ گئے ہیں۔

جو کل دکانوں کے پھٹوں پر بیٹھ کر لسی پیا کرتے تھے آج کراچی کے عالی شان ہوٹلوں میں بیٹھ کر مشروبات پیتے ہیں اور جو لوگ کبھی سینکڑوں کی حاجتیں پوری کر دیا کرتے تھے آج ایک وقت کی روٹی کو ترس رہے ہیں۔ ترازو کے پلڑے اوپر تلے ہوگئے ہیں۔ کایا پلٹ سی ہوگئی ہے اور اس حیرت انگیز انقلاب کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر ہوا ہے۔ کپڑا

پہلے سے زیادہ ملنے لگا ہے لیکن اس کے رنگ کچے ہیں۔ سوت کمزور پڑ گیا ہے۔ تیسری بار پہننے سے پھٹ جاتا ہے۔ سڑکیں کشادہ ہوگئی ہیں لیکن گرد و غبار زیادہ اڑنے لگا ہے۔ پہلے کبھی کوئی انسان قتل ہوتا تھا تو سرخ آندھی آیا کرتی تھی مگر اب ذرا سے تنازعے پر بھائی، بھائی کو ہلاک کر دیتا ہے لیکن درخت کا ایک پتا تک نہیں ہلتا۔ کل سنگ مرمر کا جو دودھیا ٹکڑا مسجد کے صحن کی زینت ہوا کرتا تھا آج اسے ہم فٹ پاتھ پر لوگوں کے پاؤں تلے گھستے دیکھ رہے ہیں اور کل جو نوکر مالک کے ادنیٰ اشارے پر بازار کے ہزاروں چکر لگایا کرتا تھا آج اپنی کوٹھی کی نشست گاہ میں بیٹھا احکام صادر کرتا ہے۔ کل تک جو دودھ خالص تھا آج اس میں پانی ملا ہوا ہے۔ کل پانی جو پانی شفاف تھا آج اس میں ریت کی آمیزش ہے۔ گائے کے دودھ میں طاقت تھی، قوت تھی اور آج ماں کا دودھ بے اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے دیانت داری، مخلصی، خدا ترسی اور روشن ضمیری کے ان اصولوں کو ترک کر دیا ہے جو کبھی ہماری خصوصیات میں شامل ہوا کرتے تھے۔ سماجی عظمت اور بہبود کے اس کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں صرف اپنے گریبانوں میں ہی نہیں جھانکنا ہوگا بلکہ انتھک محنت اور مسلسل لگن کے ساتھ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی فلاح اور خوش حالی کے لئے ذمہ داری سے کام کرنا ہوگا۔ جھوٹی گواہی دینے والے کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ وہ کسی کی زندگی سے کھیل رہا ہے۔ ملاوٹ کے بہیمانہ جرم کے مرتکب ہونے والوں کو یہ علم ہونا چاہیئے کہ وہ پوری نسل کی جڑ پر کلہاڑا چلا رہے ہیں۔ زبردست سیلاب کے بعد کچھ عرصہ تک دریا کا پانی ضرور میلا کچیلا رہتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ تیز رفتار موجیں اسے پھر سے شفاف کر دیتی ہیں۔

میں کل کا ذکر اس لئے نہیں کر رہا کہ میں آج سے اس کا موازنہ کروں بلکہ اس لئے کہ کل میں ثریا سے ملا تھا۔ ثریا جس کا رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں شربتی تھیں، جس کے بال سیاہ تھے اور جو سر کے درمیان میں مانگ نکالا کرتی تھی، جس کی آواز میں تازگی اور کنوارپنے کی حیا تھی اور جس نے بیاہ والے دن کانوں میں سونے کے جڑاؤ بندے پہن رکھے تھے۔ جب عورتوں میں کھانا لگانے کا وقت آیا تو میں جان بوجھ کر سیڑھیوں میں سب سے اوپر کھڑا ہو گیا۔ دیگوں سے لے کر دوسری منزل کی آخری سیڑھی تک میں آخری مرد تھا میرے بعد عورتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ کھانے کا طشت آدمیوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہوا مجھ تک آتا اور میں

اسے اپنے آگے کھڑی عورت کے ہاتھوں کے حوالے کر دیتا۔ افسوس صرف اتنا تھا کہ جس مقصد کے لئے میں نے اتنی جدوجہد کی تھی وہ حل نہ ہوا تھا۔ یعنی ثریا مجھ سے تیسرے نمبر پر دروازے میں کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو مجھ سے طشت لے کر ثریا کے ہاتھوں میں دے دیتی۔

پھر بھی میں ثریا کے قریب ہونے پر ہی خوش تھا اور ہر بار طشت آگے بڑھاتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔ ثریا بالکل چپ تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے پہچانتی تک نہیں۔ اتفاق سے ہمارے درمیان والی عورت کا بچہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ سب کام چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی اور میں نے نیچے سے آیا ہوا طشت بڑی عقیدت سے ثریا کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

"دیکھئے کہیں قورمہ کپڑوں پر نہ گر جائے۔"

ثریا تو گھبرا ہی گئی۔ آخر اتنی بھی شرم کیا کہ آدمی بات کا جواب تک نہ دے سکے۔ اب یہ ہوتا کہ ہر بار طشت آگے کرتے ہوئے میں ثریا کو ایک آدھ جملہ ضرور کہہ دیتا جس کا وہ جواب تو کوئی نہ دیتی۔ ہاں گھبرا کر شرم سے لال ہو جاتی اور اس کے ہاتھ کپکپا جاتے۔

ثریا کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سونے کی انگوٹھی تھی۔ اس انگوٹھی میں سبز رنگ کا نگ جڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک بار کہا:۔

"انگوٹھی بڑی خوبصورت ہے۔"

ثریا چپ رہی اور اس نے طشت میرے ہاتھوں سے لے لیا۔ دوسرا طشت پکڑتے ہوئے میں نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے آپ کو سبز رنگ بہت پسند ہے۔"

ثریا کچھ نہ بولی۔ تیسری بار میں نے کہا:۔

"آپ کی انگوٹھی میں نگینہ موجود ہے لیکن معلوم ہوتا ہے منہ میں زبان نہیں ہے۔"

اس پر ثریا مسکرا دی۔ بالکل بے معلوم سے انداز میں، جس کو صرف میں ہی محسوس کر سکا۔ جیسے کھل کر برسنے کے بعد بادلوں میں کبھی کبھی دھیمی سی چمک لہرا جائے۔ میرا دل چاہا کہ پلاؤ قورمے سے بھرا ہوا طشت لے کر سارے شہر میں گھوم جاؤں اور ہر گھر میں، ہر کوٹھڑی میں ہر آدمی، ہر عورت، ہر بچے کو کبھی پلاؤ کھلاؤں، کبھی بریانی، کبھی زردہ اور کبھی

قورمہ۔ نہ طشت کی چیزیں ختم ہوں اور نہ گھروں میں لوگ۔!

"بس کرو جی ------ بس کرو ------ اب خالی چاول لاؤ۔"

اسی ادھیڑ عمر عورت نے نعرہ لگایا۔ عورتوں میں پورا کھانا تقسیم ہو چکا تھا۔ ثریا کو مجبوراً عورتوں میں اور مجھے نیچے مردوں میں آ جانا پڑا۔ لیکن میں دوسرے ہی لمحے خالی پلاؤ سے بھرا ہوا تھال لئے پھر ادھر آ گیا۔ مگر افسوس کہ وہ تھال مجھ سے بٹالے کی ایک موٹی تازی عورت نے پکڑ لیا اور شلوار کے پائنچے اٹھائے وہ بڑی چابکدستی سے عورتوں میں چکر لگا کر چاول بانٹنے لگی۔ ثریا اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ دوسری منزل کی بڑی الماری کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ میری اس بے بسی کی حالت کو دیکھ کر وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

اب عورتوں اور لڑکیوں نے دلہن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ سسرال والیاں دلہن کے کپڑے اور زیور دکھلانے لگیں۔ اس کے بعد ڈھولک پر لڑکیوں نے گیت گانے شروع کر دیئے۔ ثریا ڈھولک بجانے لگی۔ میں دوسرے کمرے کے روشندان سے لگا یہ سارا منظر دیکھتا رہا۔ اس کی نازک سی گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی اور اس کے مہندی لگے ہاتھ بڑی دلکش بے نیازی کے ساتھ ڈھولک پر پڑ رہے تھے۔ پہلے دوسری لڑکیاں گاتی رہیں پھر جب سبھوں نے ثریا کو مجبور کیا تو اسنے آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے شروع کیا:۔

ادھی راتیں پکے کیلے
بچھڑے یار رب میلے
تساں نوں مان و طناں دا
اسیں ہاں یار پردیسی

آدھی رات کو باغوں میں کیلے بیٹھے
ہو جاتے ہیں۔ خدا بچھڑے ہوئے دوست
کو ملا دے۔
میرے محبوب! تمہیں اپنے وطن کا مان ہے
اور ہم تو پردیسی ہیں۔

ثریا کی آواز بڑی نازک اور خشک تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پت جھڑ کی دلگیر ہوا پگڈنڈی پر گرے ہوئے خشک پتوں کو ادھر ادھر اڑائے لئے پھر رہی ہو۔ ثریا کی آواز کا جادو سنگیت کی لہروں

پر اپنی شخصیت کے بھرپور عروج پر تھا۔ بولتے میں اس کی آواز نرم اور حجاب آلود تھی، لیکن اس میں اداسی اور ایک سہمی ہوئی سی بے حجابی سی آ گئی تھی۔

ثریا کی آواز کی اس متضاد کیفیت نے مجھے متاثر کیا دلہن کو رخصت کیا جانے لگا تو ایک بار پھر ہنگامہ سا مچ گیا۔

جہیز کا سامان جو گلی میں نمائش کے لئے لگا دیا گیا تھا اب ٹرک میں لادا جانے لگا۔ بینڈ بجانے والوں نے الوداعی نغمہ شروع کر دیا۔ مسعودہ گہنے اور کپڑوں میں لدی پھندی والدہ اور بہنوں کا سہارا لئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ بڑے بھائی صاحب نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کار میں سوار کرادیا۔ لڑکے والوں نے کار کے اوپر سے پیسے اور اکنیاں لٹائیں۔

لوٹنے والوں نے طوفان بدتمیزی بپا کر دیا۔ سانسی قبائل کے ہٹے کٹے فقیر بانس پر کپڑا چڑھائے ان کے بادباں بنائے سامنے کھڑے تھے۔ جب پیسوں کا بھرپور ہاتھ پھینکا جاتا تو وہ بادبان پھیلا کر سارے پیسے سمیٹ لیتے اور محلے کے بچے انہیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے رہ جاتے۔

دلہا دلہن اور دو ایک قریبی رشتہ دار عورتیں کار میں اور باقی لوگ بس میں سوار ہو گئے۔ سامان وغیرہ ٹرک میں لاد دیا گیا۔ ثریا اپنی والدہ اور بڑی بہن کے ساتھ بس میں اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی والدہ سے جا کر پوچھا:۔

چچی جان! "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں"؟

ثریا کی ادھیڑ عمر کی ماں تکلف سے مسکرا دی۔

نہیں بیٹا۔ "دلہن لے جا رہے ہیں اب اور کیا چاہیئے۔"

دوسری عورت بولی:۔

"خدا دونوں کو محبت اور سلوک دے۔"

میں نے ثریا کی طرف غور سے دیکھا۔ ثریا نے شرما کر گردن جھکا لی۔ ثریا کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ میں اس طرح باہر کھڑا تھا کہ میرا ایک ہاتھ کھڑکی کی پٹی پر تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ذرا سا کھسکا کر ثریا کے بازو کے قریب کر لیا اور ------

اس کی ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے بڑے اطمینان سے ثریا کے بازو پر چٹکی بھر لی۔ ثریا کپکپا سی اٹھی اور اس نے اپنا بازو ذرا سا کھسکا لیا۔

"بیٹا اب ہم لوگوں سے بھی میل ملاپ رکھنا ہو گا۔ بٹالے آؤ تو ہمارے گھر ضرور آنا۔"

میں ثریا کی والدہ کی اس تجویز پر بے حد خوش ہوا۔ میں نے مسکرا کر کہا:۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے چچی جان کہ بٹالے آؤں اور آپ سے نہ ملوں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے ثریا کے ایک چٹکی لے لی۔ ثریا چپ چاپ بت بنی بیٹھی رہی۔ اب سارا قافلہ چلنے کو تیار تھا۔

دلہا کے والد صاحب نے چاروں طرف گھوم پھر کر کوچ کی منادی کر دی اور جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو خود ٹرک میں سوار ہو گئے جس میں جہیز کا سامان رکھا تھا۔ ڈرائیور نے ہارن دیا اور بارات مسلم ہائی سکول کی طرف سے ہو کر پٹھانکوٹ روڈ پر روانہ ہو گئی۔ ثریا نے بڑی احتیاط کے ساتھ کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے ثریا کو سلام کیا۔ والدہ نے بتیسی کھول کر سلام کا جواب دیا۔ ثریا بت بنی بیٹھی سامنے دیکھتی رہی۔ ہم لوگ مسلم سکول کی نکڑ پر کھڑے رہ گئے اور بارات میری بہن مسعودہ اور میری دوست ثریا کو لے کر مجیٹھ روڈ پر رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیروں میں گم ہوتی چلی گئی۔ کچھ دور تک ہمیں بس کی عقبی سرخ بتی نظر آتی رہی۔ پھر وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

کیا یہ جدائی کسی بہت بڑی ملاقات کا پیش خیمہ ہے؟

اس رات گھر بھر میں اداسی رہی۔

لیکن چونکہ ہر شخص بہت تھکا ماندہ تھا لہٰذا جلدی ہی سو گئے اور صبح آنکھ کھلی۔ کرسیاں۔ دیگیں اور دوسری چیزیں صبح صبح واپس پہنچا دی گئیں۔ دن بھر گم شدہ چیزوں کی تلاش اور کرایہ کی چیزوں کی واپسی کا کام شروع رہا۔ شام کو جا کر ہر شے اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔ دوسری بہنوں اور بھائیوں نے مل جل کر نشست گاہ اور دوسری منزل کے کمروں کو دھو دھلا کر صاف ستھرا کر دیا۔ اور اگلی صبح جب مسعودہ اپنے خاوند کے ساتھ آئی تو اسے اس گھر میں اور پہلے والے گھر میں کوئی فرق دکھائی نہ دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں شادی کا ہنگامہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ صرف گلی والی پتوں کی جھنڈیاں اور کیلے کی گری پڑی شاخیں اس ہنگامۂ شادی کا راز فاش کر رہی تھیں۔ دلہا صاحب کی ناک مجھے پہلے سے کچھ زیادہ ہی لمبی دکھائی دی اور سر کچھ مزید گنجا محسوس ہوا۔

آج آپ نے ریٹھا ایسی آنکھوں پر نگاہ کی عینک بھی چڑھا رکھی تھی۔ عجیب بے ڈھنگا سا آدمی تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اونٹ آدمی بننے کی کوشش کر رہا ہے اور یا آدمی اونٹ کی جنس کی طرف رجوع کر رہا ہے۔

مسعودہ بڑی مطمئن اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ آج وہ ہم بھائیوں سے بڑی گھری محبت سے پیش آئی۔

سسرال میں صرف ایک دن رہ کر ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ محبت اور مخلصی صرف میکے میں ہی مل سکتی ہے۔ دلہا میاں ایک دن اور رات ہمارے ہاں رہے۔ اس دوران میں ان کی خوب خوب خاطر مدارات ہوئیں۔ وہ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ والد صاحب نے کیونڈر (ذرا ٹھریئے، کیونڈر کا مرحوم سگریٹ یاد آگیا۔ ہری اوم! کیا سگریٹ ہوا کرتا تھا) کا پورا ڈبہ بازار سے منگوا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ رات کو زبردست بریانی اور کشمیری ڈش گشتابہ پکائی گئی۔ دلہا صاحب کو کمپنی باغ والے ریالٹیو سینما میں "جواب" فلم دکھائی گئی۔ میں بھی بڑے بھائی صاحب کے ساتھ گیا۔ دلہا میاں ہمارے ساتھ ہال سے باہر نکلے تو آپ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے "یہ دنیا طوفان میل۔" گنگنا رہے تھے۔

دسمبر کے شروع میں میں والدہ کے ہمراہ بٹالے گیا۔ امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر پٹھان کوٹ جانے والی گاڑی شریف پورہ کی آبادی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی دلی جانے والی

لائن کو چھوڑ کر پٹھانکوٹ والی پٹڑی پر بٹالے کو ہولی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ ان دنوں دسمبر میں کڑاکے کا جاڑا پڑا کرتا تھا۔ دھوپ بے حد چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ دائیں بائیں حد نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں پیلی پیلی سرسوں پھول رہی تھی۔ بیچ میں کہیں کہیں گاؤں کے کچے مکان کھڑے تھے اور کچے رستوں پر چارے اور سرسوں کے گٹھوں سے لدے ہوئے گڈے سست رفتار میں چلے جا رہے تھے۔ آم اور جامن کے گنجان درختوں میں مسجدوں کے سفید سفید گنبد اور مینار دھوپ میں چمک رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم بٹالہ پہنچ گئے۔

بٹالہ خوب بھرا پرا قصبہ ہوتا تھا۔ سٹیشن عام وضع کا دیہاتی سا تھا۔ ایک چھوٹی سی نیم پختہ سڑک قصبے تک چلی گئی تھی۔ یہاں لوہے کے بڑے بڑے تاجروں نے بڑی کشادہ عمارتیں بنوا رکھی تھیں۔ چند ایک مغل زمانے کی یادگار عمارتیں تھیں۔ جن کی دیواروں پر بارشوں کی وجہ سے کائی جم رہی تھی۔ قصبے کے باہر چھوٹے بڑے جوہڑ تھے۔ جن میں بوجھل بوجھل سست رو بھینسیں لیٹی جگالی کر رہی تھیں اور کوے ان کو ٹھونگے مار مار کر پریشان کر رہے تھے۔ سڑک پر دو رویہ ٹاہلیوں کے گنجان درخت تھے۔ قصبے کے لونڈے ایک میدان میں کنکوے اڑا رہے تھے۔ مسعودہ کے سسرال کا گھر قصبے کی گنجان آبادی میں اندر جا کر تھا۔ اس مکان تک پہنچنے کے لیے ہمیں انتہائی بینگی ٹیڑھی اور بوسیدہ گلیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ یہاں اکثر مکانوں کے آگے بوریئے لٹک رہے تھے اور مکانوں کے ٹوٹے ہوئے پرنالے گندا پانی پھینک رہے تھے۔ گلیوں کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور نالیاں گارے سے منہ در منہ بھری ہوئی تھیں۔ مکان سہ منزلہ تھے اور ان کی وضع قطع ایسی تھی کہ ان کو دیکھ کر امرتسر کے مکانوں کا خیال ضرور آ جاتا تھا۔ مسعودہ کے سسرال کا مکان سہ منزلہ تھا اور باہر تازہ تازہ سیمنٹ پھرا ہوا تھا۔ پرنالہ نیا لگا ہوا تھا اور ڈیوڑھی کے چبوترے کی مرمت ہوئی تھی۔ جب گھر میں شادی ہونے والی ہو تو اس قسم کی مرمتیں ضرور ہوا کرتی ہیں۔

مسعودہ والدہ سے گلے لگ کر ملی۔ لمبی ناک والے دلہا میاں ابھی تک بٹالے میں ہی تھے۔ انہوں نے ایک ماہ سے کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ ولائت کے چھ سات چکروں سے اس نیک بخت کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ شادی کے بعد ہنی مون ضرور منانا چاہیئے، سوئٹزر لینڈ میں یا بٹالے میں۔

کمرے تنگ تنگ سے تھے اور بھاری بھر کم سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ دیواروں

ے تازہ تازہ چونے کی بو آرہی تھی۔ مسعودہ کے جہیز کا سامان الل ٹپ ادھر ادھر گھسا دیا گیا تھا۔ دونوں صوفے لکڑی کے بڑے صندوق پر اوندھے پڑے تھے جن کے اوپر قرآن شریف کی رحل پڑی تھی۔ کمرے میں دونوں بڑے پلنگ بچھے تھے۔ جن کے ایک طرف چوڑے پایوں والا بینڈک نما صوفہ رکھا تھا۔ دیوار گیر سے مسعودہ کا زرتار دوپٹہ اور دلہا صاحب کا اوور کوٹ اور قراقی ٹوپی ٹنگی ہوئی تھی۔ ایک طرف مکہ مدینہ کے خوبصورت قطعے کے ساتھ شادی کے دن والا سہرا لٹک رہا تھا جس کے پھول باسی ہو کر جھڑنا شروع ہو گئے تھے۔

ان لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ لیکن مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اگر بٹالے آیا تھا تو دل میں صرف یہ امنگ لے کر کہ ثریا سے ملاقات ہو گی۔ مجھے بٹالے کی ہوا خوشگوار اور دھوپ بڑی چمکیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس شہر کی خاک سے مجھے ان پھولوں کی مہک اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ جن کے بیج ابھی منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے تھے۔ یہ سوچ کر کہ میں بھی اس فضا میں سانس لے رہا ہوں جس فضا میں ثریا کے کپڑوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے میرا دل خوشی کے جذبے سے معمور ہو رہا تھا۔

ثریا مسعودہ کے خاوند کی خالہ زاد بہن تھی اور معلوم ہوا کہ ان کا گھر یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر تین گلیاں چھوڑ کر قصبے کے کنارے پر واقع ہے۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ نہ ثریا کو وہاں بلوا سکتا تھا اور نہ خود اکیلا وہاں جا سکتا تھا۔ پرانے لوگ جو یہ کہہ گئے ہیں کہ عشق میں ایک نہ ایک رازدار کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ بالکل سچ کہہ گئے ہیں۔ مگر میرا رازدار کون ہو؟ والدہ؟ ارے توبہ بھائی؟ خدا پناہ! مسعودہ؟۔۔۔ کسی حد تک ممکن ہے۔

مسعودہ والدہ کے لئے جانماز لینے دوسرے کمرے میں گئی تو میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

"آپی تمہارا تو یہ کمرا بھی بڑا پیارا ہے۔"

مسعودہ مسکرائی۔

"ارے یہ کوئی میرا تھوڑا ہے۔" یہ تو میری نند کا ہے۔

وہ صندوق کھول کر اس میں سے جانماز ڈھونڈھ رہی تھی۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں بڑا بے نیازی سے پوچھا۔

"آپی وہ ۔۔۔۔۔۔ وہ ثریا کا مکان کہاں ہے۔"

"کیوں تمہیں اس سے کیا؟"

میں گھبرا سا گیا۔ مجھے مسعودہ سے اس جواب کی امید نہ تھی۔ میں نے جلدی سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔

"یونہی پوچھ رہا تھا۔"

مسعودہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں قریب ہی ہے۔ اسے بلوا دوں؟"

میں کھسیانا سا ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔

"ارے نہیں آپی۔ بھلا مجھے اس سے مل کر کیا لینا ہے۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔"

خدا جانے مسعودہ نے میرے دل کی کیفیت بھانپ لی تھی یا کیا بات تھی بہرحال اس نے صندوق بند کرتے ہوئے کہا:

"فکر نہ کرو۔ ابھی بلوائے دیتی ہوں"

میں نے جلدی سے کہا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔

"نہیں نہیں آپی۔ میں تو مذاق سے پوچھ رہا تھا"

"چلو چھوڑو۔ اب باتیں نہ بناؤ"

چنانچہ اس نے یہی کیا۔ ایک عورت کو ثریا کی والدہ کے گھر دوڑا کر انہیں ہماری آمد کی خبر کر دی گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ وہاں آن موجود ہوئے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ ثریا اپنی والدہ اور بڑی بہن کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ مسعودہ نے بڑی ہمدردانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور ادھر لے جا کر بولی۔

"اب اس میں میرا کوئی قصور نہیں"

میں شرم سے لال ہو گیا مگر خاموش رہا۔ مسعودہ خود بخود ہی میری رازدار بن گئی تھی۔ ثریا گھنٹہ بھر وہاں بیٹھی میری والدہ اور بڑی بہن سے باتیں کرتی رہی۔ اور شام کے کھانے کی دعوت دے کر چلی گئی۔ اس نے گھر آنے کی دعوت دی تو والدہ نے انکار کر کے میری جان ہی نکال دی۔

"نہیں بہن آپ کو میری قسم ہے جو نہ آئیں۔"

"اچھا بہن تم اگر مجبور کرتی ہو تو ------"

اب میری جان میں جان آئی۔ جتنی دیر دونوں عورتیں ایک دوسرے کو قائل کرتی رہیں۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہا۔ میری حالت اس ملزم کی سی تھی جو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا اپنے موافق اور مخالف وکیلوں کی بحث سن رہا ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہوا۔ اور میں شام کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔

ابھی دن کے سائے پوری طرح شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں مدغم نہیں ہوئے تھے کہ ہم لوگ مسعودہ اور اس کے خاوند کے ساتھ ثریا کے گھر کی جانب چل پڑے۔ گلیوں میں ٹھنڈ اتر آئی تھی اور خنک ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دو تین گلیاں گزر کر ہم لوگ قصبے کے کنارے والے ایک پختہ دو منزلہ مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ ثریا کی والدہ ہمیں لینے ڈیوڑھی میں آ گئی۔ ڈیوڑھی میں ایک طرف غسلخانہ تھا جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اور اندر ایک بے قلعی اور بد وضع سا حمام رکھا تھا۔ جس کی لکڑی کی چوکی ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ تنگ سی سیڑھیاں چڑھ کر ہم دوسری منزل پر آ گئے۔ دوسری منزل میں ایک چوڑا سا صحن تھا۔ جس کے دونوں جانب کمرے تھے اور سامنے کی طرف ستونوں والے برآمدے میں باورچی خانہ بنا ہوا تھا جہاں ثریا بیٹھی چولہے پر چڑھے ہوئے بڑے سے دیگچے میں کفگیر ہلا رہی تھی۔

والدہ کو دیکھ کر وہ اٹھ کر دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ان کے قریب آئی اور انہیں سلام کیا۔ والدہ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔ ثریا نے میری طرف بالکل نہ دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ لڑکی بڑی سمجھ دار ہے اور اس نے میری محبت کی پیش کش کو قبول کر لیا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ مجھ سے آنکھیں نہ چراتی۔ ثریا نے سفید ساٹن کی شلوار، کتھئی رنگ کی کریب کی قمیض اور تاروں جڑی کوٹی پہن رکھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہائی ہے۔ اس کے بال گیلے تھے اور اس نے گردن پر سبز تولیہ ڈال رکھا تھا۔ جب وہ والدہ کا ہاتھ سر پر لینے کے لے جھکی تو مجھے اس کے جسم سے لکس صابن کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔

ہمیں دوسری منزل کے ایک ایسے آراستہ کمرے میں بٹھایا گیا جس کی تینوں کھڑکیاں باہر کھیتوں میں کھلتی تھی۔ ان کھیتوں میں دور دور تک درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے، جہاں شام کا اندھیرا دھواں بن کر چھا رہا تھا۔ قریب ہی ایک سکھ کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے بیلوں کو ٹٹخار رہا تھا۔ پاس ہی گوبر کے ڈھیر پر مرغیاں چونچیں چلا رہی تھیں۔ دو لڑکے

کھیس میں منہ ڈھانپے پتلا دیسی کماد چوستے چلے جا رہے تھے۔ آبادی کے پرلے کنارے پر ذرا اونچان پر ایک مسجد کے دودھیا گنبد کو سورج کی الوداعی سنہری کرنیں بوسہ دے رہی تھیں۔ ایک گوردوارے کے سنہری کلس کی نوک سورج کی طرف منہ کئے چمک رہی تھی۔

ان کھڑکیوں کی طرف سے اب ٹھنڈی سرد اور شبنم آلود گیلی ہوا اندر آنے لگی تھی۔ ثریا کی والدہ نے کھڑکیاں بند کر دیں اور بتی جلا دی۔ کمرہ کشادہ اور بڑی سادگی سے سجا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ اونچی پٹی والا پرانی طرز کا پلنگ لگا تھا۔ اس پلنگ پر لحافوں اور گرم دریوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ تین چار آرام کرسیاں لگی تھیں۔ شیشہ لگی دیوار گیر الماریوں میں چینی کے برتن سج رہے تھے۔ کارنس پر پیتل کی دو گلاب دانیاں سوئی دھاگہ رکھنے والی ایک چھوٹی ٹوکری، پاؤڈر کا ڈبہ، تیل کی بوتل اور ثریا کے مرحوم والد کی فریم کی ہوئی تصویر پڑی تھی۔

فرش پر سوزنی بچھی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ثریا کے دونوں بڑے بھائی چاول اور کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اور سارا گھر انہی کے سر پر چل رہا تھا۔ دونوں بڑے مرنجان مرنج تھے اور ہمارے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ وہ ثریا کو بلا بلا کر کہتے کہ فلاں چیز اندر بھیج دو۔ فلاں چیز وہاں سے منگوا لو۔ میں جوتا اتارے ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اور دھڑکتے ہوئے دل اور مسرت سے بھرپور دماغ کے ساتھ ثریا کو باہر باورچی خانے میں خادمہ کو ہدایت دیتے دیکھ رہا تھا۔ سارے گھر میں دار چینی اور بادیاں خطائی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میری والدہ، ثریا کی والدہ، مسعودہ اور میری بڑی بہن اور ثریا کی بڑی بہن خوب دل کھول کر باتیں کر رہی تھیں۔ اور میں بظاہر بڑا بھولا بنا بڑی مکاری کے ساتھ ثریا کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا تھا۔ اب اس نے بال سنوار کر سر پر ان کا جوڑا سا بنا لیا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ پانی کا تسلہ اٹھائے گھڑے کی طرف آئی تو اس نے میری طرف دیکھ لیا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سلام کر دی۔

ثریا نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ویسے اس کے چہرے پر آئی ہوئی سرخی اور تبسم کی ہلکی سی لہر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اسے میرے آنے کی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مسعودہ کبھی کبھی باتوں کے دوران میں میری نظروں اور چہرے کا مطالعہ کر لیتی۔ اس کے سامنے اب مجھے محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

کیونکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ اسے میری ثریا سے محبت کا علم تھا اور وہ اس سلسلے میں میری ہر طرح مدد کرنا چاہتی تھی۔ جس طرح کہ محبت کرنے والی بھولی بھالی بہنیں اکثر کیا کرتی ہیں۔ انہیں ہمارے رومان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انہیں تو صرف اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے کچھ کر رہی ہیں۔

میں کمرے میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گیا اور اٹھ کر مکان کی چھت پر چلا گیا۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔چھت کا فرش کچا تھا۔ چھت کی پانچ پانچ فٹ اونچی دیواریں پختہ تھیں۔ ایک طرف برساتی تھی اور اس کے پہلو میں ایک اور کوٹھڑی تھی جس کے دروازے پر پرانی طرز کا دیسی تالہ پڑا تھا۔ اس کوٹھڑی کی چھت کو کوئی سیڑھی نہ جاتی تھی۔ برساتی میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جس میں سے باہر دور تک کھیتوں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

یہاں سردی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ جلا کر پینے لگا۔ قصبے کی پرانی دیوار کے ساتھ ساتھ مکانوں میں کہیں کہیں روشنیاں ہو رہی تھیں اور شام ڈوب چکی تھی۔ کھیتوں پر دھند سی پھیل گئی تھی اور مکانوں میں سے اٹھتا ہوا اوپلوں کا کڑوا دھواں ان کے اوپر ہی جم کر رہ گیا تھا۔ کسی کارخانے سے لوہا کوٹنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ طوطوں کی ایک ٹولی چیختی ہوئی اوپر سے گزر گئی۔ مکان کی دیوار کے عین نیچے بھنی ہوئی مکئی بیچنے والی کی بھٹی تھی۔ جس کے دھوئیں نے دیوار کو اوپر تک کالا کر رکھا تھا۔ یہ عورت اپنی کٹیا میں تیل کی کپی جلائے بیٹھی تھی اور ایک کتا کٹیا کے آگے برابر بھونکے جا رہا تھا۔ قریب ہی کہیں سے ایک بھینس کے ڈکارنے کی صدا آ رہی تھی۔ دور کھیتوں کی جانب سے آٹا پیسنے والی چکی کی مسلسل گک گک سنائی دے رہی تھی۔

یہ فضا بیک وقت بڑی سوگوار اور بڑی پرسکون سی تھی۔ ایک بے نام سی اداسی کی سرد لہر دل کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ سڑک کے لیمپوں پر کہرا جم رہا تھا اور دھندلی گیلی روشنی باہر نکلنے کی بڑی جدوجہد کر رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑکی میں جھکا کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ میں سوچتا رہا اگر ثریا سے میری شادی ہو جائے تو پھر: گھر، اس گھر کی یہ کھڑکی میری ہو گی۔ اس پر جتنا حق میرا ہو گا اور کسی کا نہیں ہو گا۔ میں جب چاہوں اور جتنی دیر تک چاہوں یہاں کھڑا ہو سکتا ہوں۔ پھر ثریا بھی میرے پہلو میں کھڑی ہو گی اور میں اس کا گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بڑی غمگین محویت سے پنجاب کے قصبوں کی

سردیوں کی شام والی اداسی کو اپنے دل میں جذب ہوتے دیکھا کروں گا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے اپنے گہرے موڈ سے چونک کر پیچھے دیکھا اور میں حیران سا ہو کر رہ گیا۔ ثریا جانے کب سے مجھ سے ذرا فاصلے پر کوٹھڑی کے باہر کھڑی اس کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے کان ایک دم گرم ہو گئے اور ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں بت سا بن کر وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ ثریا نے بہت سر مارا مگر تالا بالکل نہ کھلا۔

میں نے قریب آ کر کہا:۔

"لاؤ میں کھول دوں"

ثریا نے گہری گہری پلکیں اٹھا کر تیز بن کر دل میں کھب جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ زبان سے کچھ نہ کہا اور کنجی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے مس ہوئیں تو میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ ثریا کی انگلیاں ٹھنڈی تھیں۔ تالا پرانا تھا اور اس کے پرزے ٹھنڈ کی وجہ سے جام ہو گئے تھے۔ میں نے کافی زور آزمائی کی تب کہیں جا کر تالا کھلا۔ میں نے دروازے کے پٹ کھول دیئے اور تالا کنجی ہاتھ میں لے کر وہیں کھڑا رہا۔ ثریا کوٹھڑی کے اندھیرے میں داخل ہو گئی۔ اندر مجھے صندوق کھلنے کی آواز آئی۔ میرے پاؤں سن سے ہو گئے۔ اور ماتھا گرم ہو کر جلنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے پاؤں برف میں گاڑ دیئے ہیں۔

یہ ایک لمحہ انتہائی معمولی اور انتہائی قیمتی تھا۔ انتہائی انمول اور پھر کبھی ہاتھ نہ آنے والا تھا۔ قدرت کے نظام نے سینکڑوں سالوں تک اس لمحے کا انتظار کیا تھا۔ ہزارہا سالوں سے اس ایک ثانیے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ ایک نقطہ کروڑہا الفاظ کی تحریر کے بعد ثبت ہوا تھا۔ پتھر کے اس ٹکڑے نے نیلم بننے کے شوق میں دو پہاڑوں کی درز میں آ کر صدیوں تک چاند کی کرن کا انتظار کیا تھا۔ کب سورج چاند کی گردش سالوں کے چکر کے بعد اس ایک زاویئے پر آئے جہاں ایک پل کے لئے چاند کی کرن اس پتھر پر پڑے اور وہ مٹی سے سونا بن جائے۔ وہ گھڑی آ گئی تھی۔ وہ بیش قیمت لمحہ آ گیا تھا۔ وہ کبھی نہ ضائع کرنے والا وقت آن پہنچا تھا۔

ثریا اندر صندوق میں سے کچھ نکال رہی تھی۔ باہر چھت پر پھیکے پھیکے ٹھٹھرے ہوئے ستاروں کی دھیمی دھیمی دھندلی چمک تھی۔ سیڑھیوں میں کوئی نہیں تھا۔ یہ سوچنے کی گھڑی

نہیں تھی۔ یہ بے شمار خیالوں میں الجھنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھ میں اور ثریا میں امرتسر میں اور بٹالے میں زندگی اور موت میں صرف ایک دہلیز کا فاصلہ تھا۔ ایک قدم کا بعد تھا۔ میرے پیچھے خاک اڑاتے گرم صحرا تھے اور سامنے گہرے نیلے پانیوں کا سمندر تھا، جس میں سنہری گھونگھوں، کنواری سیپیوں اور چاندی کی مچھلیوں اور حیرت انگیز پہاڑیوں گھاٹیوں اور جزیروں کے عظیم پراسرار راز دفن تھے۔

اور میں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

(میں کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ ثریا کے جسم کی خوشبو لیتا میں اندھیرے میں ثریا کے قریب جا پہنچا۔ میں نے آہستہ سے ثریا کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ثریا دم سادھے وہیں کی وہیں رہ گئی۔ میں نے آہستہ سے اس کے شانے دبائے۔ اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔ میں نے اپنا گال ثریا کے کان کے ساتھ لگا دیا۔ ثریا کا کان گرم ہو کر دہک رہا تھا۔ اس کا بندا میرے گال سے لگا ہوا تھا۔ ثریا کا سارا بدن کپکپا رہا تھا۔ میرا اپنا بدن لرز رہا تھا۔ اور آواز خشک ہو رہی تھی۔ اور دل تیزی سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

"کوئی ------ کوئی آجائے گا۔ خدا کے لیے --------"

ثریا کی آواز کانپتی ہوئی سرگوشی میں نکل رہی تھی۔

"میں صرف تمہارے لیے آیا ہوں ثریا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں گہری اور بے پایاں محبت ---"

"خدا کے لیے آپ چلے جائیں ---"

"میں تمہیں امرتسر سے خط لکھوں گا ثریا -------- مسعودہ تمہیں میرا خط پہنچا دیا کرے گی ----"

"ہائے اللہ ایسا نہ کریں میں مرجاؤں گی۔"

"تم میری زندگی ہو ثریا۔ تم کبھی نہیں مرسکتیں۔"

"خدا کے لیئے مجھے چھوڑ دیں -------- خدا کے لیے --- ہائے اللہ۔"

اور میں نے ثریا کو اپنی طرف کھینچ کر اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے رات بھر کے پالے میں ٹھٹھرے ہوئے گلاب کے پھول پر ہونٹ رکھ دیئے ہوں۔ ثریا کے ہونٹ ٹھنڈے اور خشک ہو رہے تھے۔ وہ بے جان سی ہو کر میری

آغوش میں گر پڑی۔ اس نے گردن پیچھے ڈال دی اور کانپتی ہوئی۔ لرزتی ہوئی کمزور سی آواز میں کہتی گئی۔

"اے خدا کے لیئے ایسا نہ کریں ----- کوئی دیکھ لے گا۔ میں مرجاؤں گی۔"

"اری ثریاں! ----- دستر خوان نہیں نکلے ابھی؟"

اچانک نیچے سے کسی نے آواز دی۔ ثریا میں ایک دم زندگی کی لہر آ گئی۔ وہ تڑپ کر میری آغوش سے نکلی اور جلدی جلدی صندوق سے دستر خوان نکالنے لگی۔ میں آہستہ سے ثریا کے بالوں کو چوما اور اتنا کہہ کر باہر آ گیا -----،

"میرے خط کا جواب ضرور دینا ثریا۔"

ثریا نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں جلدی سے کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ میری حالت اس آدمی کی سی ہو رہی تھی۔ جسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے اور یہ خبر سنائی جائے کہ اس کی لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آئی ہے۔ اسے کبھی حقیقت محسوس ہوتی ہے اور کبھی سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔ یہی کیفیت میری ہو رہی تھی۔ کبھی محسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ میرا وہم تھا۔ نہ ثریا یہاں آئی ہے اور نہ میں نے اس سے اظہار محبت کیا ہے۔ اور کبھی جب میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھتا اور اپنے ہاتھوں کو ہونٹوں کے پاس لاتا جن میں ابھی تک ثریا کے بالوں کی مہک رچی ہوئی تھی تو اس وہم کی شدید تردید ہو جاتی۔

ثریا کوٹھڑی پر تالا ڈال کر دستر خوان اٹھائے نیچے جا چکی تھی۔ میں چھت پر بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ اب میں ذرا دیر کے بعد نیچے جانا چاہتا تھا۔ میں چھت پر ٹہلتا رہا۔ اور بار بار کوٹھڑی کے تالے کو ہاتھ سے چھوتا رہا۔ یہ تالا ثریا نے اس وقت میرے ہاتھ سے لے لیا تھا جب میں اسے پیار کرنے لگا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد میں نیچے آ گیا۔ نیچے بڑی رونق لگ رہی تھی۔ کسی کو علم نہ ہوا کہ میں اس وقت بھی اوپر تھا

جب ثریا دستر خوان لینے گئی تھی۔ ویسے بھی شریف گھرانوں میں لڑکیوں پر اتنی جلدی شک نہیں کیا جاتا۔ کمرے میں دستر خوان لگا دیا گیا تھا اور کھانا اندر جا رہا تھا۔ ثریا، اس کی والدہ، مسعودہ اور دونوں نوکرانیاں برآمدے میں بیٹھیں طشت میں کھانے لگا رہی تھیں۔ ثریا کی

والدہ نے مجھے دیکھ کر پوچھا:-

"ارے بھئی خالد تم کہاں تھے؟ اندر چلو نا۔"

"بس خالہ جان ذرا بٹالے کی سیر کر رہا تھا۔"

"پھر پسند آیا ہمارا شہر۔"

"خالہ جان اتنا پسند آیا ہے کہ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

ثریا فرنی کی پلیٹوں پر پستے کی پھریری چھڑک رہی تھی۔ اس نے اپنا سر اور نیچے جھکا دیا۔

"تو پھر یہیں ہمارے پاس رہ جاؤ۔ چھوڑو امرتسر کو۔"

میں نے دل میں کہا۔ بسم اللہ کیجئے۔ دو کلمے پڑھائیے اور خاکسار سے عمر بھر کے بٹالے میں رہنے کا پٹہ لکھوا لیجئے۔ مسعودہ نے ہنستے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں کہا:-

"خالہ جان اسے زیادہ مجبور نہ کریں نہیں تو یہ یہیں رہ جائے گا۔"

ثریا کی والدہ نے بڑی شفقت سے کہا:-

"لاکھ بار رہے بیٹی۔ یہ بھی تو اس کا اپنا گھر ہے۔"

ثریا نوکرانیوں کے ہاتھوں اندر طشت بھجوانے لگی تو میں نے جھک کر فرنی کی پلیٹیں پکڑ کر کہا:-

"لائیے یہ میں لئے جاتا ہوں۔"

ثریا کا بازو میرے ہاتھ سے چھو گیا۔ وہ چھوئی موئی سی ہو کر رہ گئی اور میں اس کی والدہ کے منع کرنے کے باوجود دو پلیٹیں اٹھا کر اندر لے گیا۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ ثریا کی امی نے امرتسر سے کھنڈ قلچے منگوا رکھے تھے۔ انہوں نے خوشبودار تلخ قہوے کے ساتھ سماں باندھ دیا۔ قہوے کے بعد عورتوں کا دوسرا دور چلا جو میرے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا کہ عورتیں ساری رات بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور میں ثریا کو چلتے پھرتے بات کرتے۔ شال کا پہلو درست کرتے، قہوے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے اپنی گرم گرم چمکیلی آنکھیں جھپکاتے مجھے گھری گھری چور نظروں سے دیکھتے اور چھوٹے بچوں کو کسی بات پر جھڑکتے دیکھتا رہوں۔

مگر صد افسوس کہ عورتوں کی باتیں ختم نہ ہوئیں۔ مگر لمبی ناک والے دلہا میاں نے گھر

چلنے کی جلدی مچا دی۔ یہ صاحب ثریا کے دونوں بھائیوں سے اس وقت جتے ہوئے تھے۔ اور چاول اور کپڑے وغیرہ کے تجارتی رموز کے بارے میں انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ سے ان دونوں بھائیوں کو نیم جان کر دیا تھا۔ کوئی دس بجے رات ہم لوگ واپس گھر چلنے کے لئے اٹھے۔ ثریا اس سے پہلے اپنی بھابی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ جب اس نے ہمارے جانے کا سنا تو ایک دم چپ سی ہو گئی۔ ہم اٹھے۔ کمرے سے نکل کر دالان میں آئے اور سیڑھیاں اتر کر ڈیوڑھی میں آگئے۔ اور سلام دعا اور پھر ملنے کے وعدے وعید کے بعد ایک ایک کر کے مکان کے دروازے سے باہر نکلنے لگے۔ ثریا اپنی والدہ کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے خاص طور پر والدہ کو سلام کیا۔ شفیق عورت نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سارے بالوں کا ستیاناس کر دیا مگر میں سر جھکائے رہا۔

"پھر کبھی ضرور آنا بیٹا۔ بھولنا نہیں۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔"

ثریا بت بنی کھڑی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اب دوبارہ مجھ سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہم لوگ اگلے روز صبح واپس امرتسر جا رہے تھے۔ اور ثریا مجھے رخصت کرنے سٹیشن پر نہیں آسکتی تھی۔ میں نے آخری بار اسے حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور باہر گلی میں آگیا۔ اس رات میں نے خط کا ایک پرزہ لکھا اور مسعودہ کو دے دیا۔ مسعودہ ہنسنے لگی۔ "دیکھا میرا اندازہ ٹھیک نکلا نا۔ آخر تم کو پکڑ ہی لیا۔ اچھا میں اسے یہ خط دے دوں گی۔ مگر تم ذرا احتیاط سے کام لینا۔ کہیں بے چاری بدنام نہ ہو جائے۔ تم لوگ بڑے غیر ذمہ دار ہوتے ہو۔"

"نہیں باجی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور پھر میں اس سے زیادہ میل ملاپ رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میں تو بس کبھی کبھی صرف اسے دیکھ لینا چاہتا ہوں۔"

"بس یہ محبت ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو میں تمہارا ہر خط اسے دے دیا کروں گی۔ ابھی تو بے چاری کو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں اس کی پیامبر ہوں۔ خیر میں اسے سمجھا لوں گی۔"

"تم بڑی اچھی ہو باجی۔ اب کی دفعہ میں تمہارے لئے امرتسر سے کھنڈ قلچے ضرور لاؤں گا۔"

"چل بڑا آیا۔ میری طرف سے تو خود ہی کھا لینا۔"

وہ رات میں دیر تک سو نہ سکا۔ بار بار یہ خیال آتا رہا کہ اس وقت اس قصبے کی ایک

قریبی گلی میں ثریا سو رہی ہے۔ کیا خبر اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو اور وہ بھی میری طرح ٹکٹکی لگائے چھت کو تک رہی ہو اور سوچ رہی ہو کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ میں نے رقعے میں صرف اتنا لکھا:۔

"ثریا! لوہے اور تانبے کے شہر بٹالے میں بھی گلاب کا اتنا خوبصورت نرم و نازک اور خوشبودار پھول کھل سکتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی یقین نہیں آیا تھا۔ یہ پھول میرے ہونٹوں کو چُھو کر گزرا ہے۔ میری زندگی عطر بھرے رومال کی طرح ہمیشہ معطر رہے گی۔ جب تک تمہیں دیکھا نہیں تھا۔ تم سے محبت کرتا تھا۔ اب دیکھ لیا ہے تو تم پر جان دینے لگا ہوں۔ ہمیشہ تمہارا۔

خالد

ثریا نے میرے اس رقعے کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس رقعے کے ساتھ میں نے جواب کی توقع بھی وابستہ نہیں کی تھی۔ وہ تو اظہار حقیقت تھا۔ امرتسر آئے ہوئے مجھے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ثریا سے جُدا ہوئے اسے دیکھے ایک سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ ثریا کی گہری گہری پراسرار آنکھیں، آواز کا دھیما لہجہ، قہوہ پیتے ہوئے میری طرف اپنی گرم گرم آنکھیں جھپکا کر دیکھنا۔ فرنی کی پلیٹیں اٹھاتے وقت اس کے گداز بازو سے میرے ہاتھ کا چھو جانا، کوٹھڑی کا تاک نہ کھلنا، اس کا بے سدھ ہو کر میرے بازوؤں میں گر جانا، یہ سب کچھ خواب کی باتیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ایسا کبھی نہ ہوا ہو۔ جیسے خواب میں میں نے چاند کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا ہو اور جب نیند کھلی ہو تو اپنا ہی گریبان ہاتھ میں ہو۔ مگر میرے گال پر ثریا کے بندے کی چبھن ابھی تک باقی تھی۔ میرے ہونٹوں پر ثریا کے سرد شبنمی ہونٹوں کا کانپتا ہوا خوشبودار لمس اسی طرح موجود تھا۔ میرے کانوں میں اسکی لرزتی ہوئی آواز کا جادو پوری طرح گونج رہا تھا۔ میں صبح و شام ثریا کی یاد سینے میں دبائے امرتسر کے بازاروں، شریف پورے کی گلیوں، کمپنی باغ کی گلپوش روشوں اور ریالٹو سینما کے آس پاس والی سایہ دار راہوں پر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہتا۔

آٹھویں روز میں نے اسے محبت کے جزبات سے بھرپور ایک خط لکھا۔ میں نے اسے لکھا:۔

"میرے گلاب کے زرد پھول!"

زیتون کی وادی میں وہ سنہری سورج پھر کبھی طلوع نہ ہوا جس کی اولین پاکیزہ کرنوں نے تمہارے شبنمی ہونٹوں کی نازک پنکھڑیوں پر اپنے روشن لب رکھے تھے۔ وہ چاند پھر پہاڑ کی چوٹی پر نہ نکل سکا جس کی چاندنی نے تجھے اپنے مکان کی چھت پر دونوں ہاتھ سینے پر رکھے سوتے دیکھا تھا۔ وہ ہوا پھر نہ چلی جس کی ہر لہر نے تیری شہد آگیں سرگوشیوں کے گیت سنے تھے وہ بارش پھر نہ ہوئی جس کے موتیوں نے تجھے عصمت اور معصومیت کے مقدس سیپ میں بند دیکھا تھا۔

اس رات میں نے تیرے لئے کوٹھڑی کا تالا نہیں کھولا تھا بلکہ محبت کا وہ اسم اعظم پھونکا تھا جس نے میری تقدیر کے پٹ کھول کر مجھے محبت کے بے پایاں خزانے کے درمیان لا کھڑا کیا تھا۔ میں نے ایسی محبت کا مذاق اڑایا تھا۔ میں محبت کرنے والوں کو جب اپنے محبوب کی یاد میں دل گرفتہ دیکھتا تو ان پر ہنسا کرتا تھا۔ مگر آج میرا اپنا دل محبت کا زخم کھا کر تمہیں یاد کر رہا ہے۔

آج مجھے یقین ہو گیا ہے ثریا!

کہ محبت دنیا کی عظیم اور حیرت انگیز قوت ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جس کی وجہ سے ستاروں کی باہمی کشش قائم ہے۔ یہی سورج کو طلوع کرتی ہے اور ستاروں کا دل توڑتی ہے۔ یہی شکاری کو شکار کی طرف روانہ کرتی ہے۔ اور شکار کو چھپ جانے کا راستہ دکھلاتی ہے۔ یہی ماں کی چھاتیوں میں نورانی دودھ اتارتی ہے۔ یہی خزاں کی بے رنگ خشک ٹہنیوں میں بہار کا خوشبودار خون دوڑاتی ہے اور تازہ پھلوں کے شگوفے کھلاتی ہے۔ یہی چاند کی بالی کو منزل منزل گھٹاتی بڑھاتی ہے۔ یہی سمندروں میں طوفان لاتی ہے اور پرانے جزیروں کو نیست و نابود کرتی ہے اور نئے نئے جزیروں کو جنم دیتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو ہماری زمین کو محور کے گرد چکر دے رہی ہے۔ کہیں نظام شمسی کو ایک پر فکر سانچے میں ڈھالے ہوئے ہے۔ یہ صحراؤں میں چشمے بناتی ہے۔ یہ پیاس کی طلب پیدا کرتی ہے۔ اور پیاسے کو چشمے کے پاس لاتی ہے یہ ناریل، کے سخت چھلکے کے اندر سفید پھول کا دل بنا کر اس کی پنکھڑیوں اور ریشوں میں خوشبو کا خون دوڑاتی ہے۔ یہ تاڑ کے درختوں کو میٹھا رس عطا کرتی ہے۔ یہی جنگلوں کی گہری اندھیری راتوں میں جانوروں کی زرد آنکھیں چمکاتی ہے۔

یہ اناناس کے سنہری پردوں میں چھپکے رس کی تھیلیاں رکھ دیتی ہے۔ یہ مور کے پنکھوں پر گل کاری کرتی ہے۔ یہ سانپ کو یگانہ رنگوں کے داغ دے کر اس کے دانتوں میں زہر بھرتی ہے۔ یہ ہرن کو کلیلیں کرنا سکھاتی ہے اور شیر کو ایک ہی جست میں نہر پار کر جانا سکھلاتی ہے۔ محبت ہی عظیم ہے۔ محبت ہی اول و آخر ہے۔ اس کا جسم وہی ہے۔ اس کے لباس مختلف ہیں۔ اس کی آواز وہی ہے۔ اس کا لہجہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طاقت نے تجھے بٹالے میں اور مجھے امرتسر میں پیدا کیا۔ اسی قوت نے تجھے ہمارے ہاں آنے پر اکسایا۔ یہی طاقت مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہوئی لے گئی۔ اسی نے تمہارا تالا جام کیا اور اسی نے مجھے وہ طاقت اور ہوشیاری دی کہ میں ایک ہی کوشش میں اسے کھول کر رکھ دوں۔

میں اس عظیم طاقت کی سحر کاری اور ابدی وازلی حقیقت پر آج ایمان لاتا ہوں۔ تجھ سے اپنی محبت کا اعتراف کر کے میں دراصل اس باجبروت قوت کی ہستی کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ثریا۔ بالکل اسی طرح جس طرح شبنم پھول اور پتوں سے پیار کرتی ہے۔ ندی اپنے کناروں سے اور چاند اپنی کرنوں سے پیار کرتا ہے۔ میں تجھے اسی عقیدت سے چاہتا ہوں جس عقیدت سے پیاسا مسافر گھر جا کر اس چشمے کو یاد رکھتا ہے جس نے جلتے ہوئے صحرا میں اس کی پیاس بجھائی تھی۔ میں محبت کو بہار کی ہوا کا وہ خوش بودار جھونکا نہیں سمجھتا جو خزاں کے بے رنگ دنوں میں سبزہ زاروں کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ نہ وہ ستارۂ صبح جو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ماند پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور نہ ہی میں اسے وہ اجنبی تصور کرتا ہوں جو شام ڈھلے ہمارے دروازوں کے آگے پھول ڈال جاتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ بلکہ یہ وہ پھول ہے جو خزاں میں اپنی جوانی کے عروج پر ہوتا ہے۔ پت جھڑ میں اس کی پنکھڑیوں کے رنگ اور نکھر آتے ہیں اور اس کے سینے سے اٹھی ہوئی خوشبو کی لہر سارے باغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے معطر کر جاتی ہے۔ یہ کسی رات کی صبح کا ستارہ نہیں بلکہ وہ آفتاب ہے جو ہر ستارے کو روشنی اور زندگی عطا کرتا ہے۔

یہ جھیل مانسرور ہے جو دریاؤں کو جنم دیتی ہے۔ یہ وہ ہمالہ پہاڑ ہے جو اپنی برف پوش چوٹیوں سے سر اٹھا کر ہر پہاڑی، ہر وادی، ہر گھاٹی اور ہر مرغزار کو جھانکتا ہے۔ یہ وہ سدا بہار بادل ہے جو برستا ہے تو جنگلوں کے ساتھ ساتھ صحراؤں کو بھی جل تھل کر دیتا ہے۔ یہ وہ نرگس کا پھول ہے جو اندھا ہونے کے باوجود سب کچھ دیکھتا ہے۔

ثریا! مجھے بے شک بھلا دینا۔ شاید تم کوشش بھی کرو تو ایسا نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ محبت کا سورج ایک بار طلوع ہو کر پھر کبھی غروب نہیں ہوتا۔ خطۂ شمالی میں صرف چھ ماہ سورج چمکتا ہے مگر محبت کی وادی میں دن کبھی نہیں ڈوبتا۔ یہاں کی راتیں دن کے سائے ہیں۔ یہاں کی خوشبوئیں محبت کرنے والوں کے سانس ہیں اور یہاں کا سنگیت ان کی شہد بھری سرگوشیاں ہیں۔"

میں نے تمہیں دیکھا آج ہے۔ مگر جانتا ازل سے ہوں۔ میرے جنم کا باعث تمہارا وجود تھا۔ میں جنم جنم کے ویرانوں میں تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ موت ہمارے وصال کا حرف اول ہوگا۔ جس طرح آوارہ گرد ڈچ مین اپنے کبھی نہ ڈوبنے والے۔ کبھی نظر نہ آنے والے جہاز میں بیٹھ کر اپنی پنڈورا کی جستجو میں نکلا تھا اور کئی سو سالوں کے بعد اس سے ملا تھا۔ اسی طرح میں بھی زندگی کی کشتی پر بیٹھا تمہاری تلاش میں سمندروں کا پانی کھنگال رہا تھا۔ طوفانوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ آندھیوں سے سر ٹکرا رہا تھا۔

میں نے ایک طویل ریاضت ایک حوصلہ شکن تپسیا کے بعد تجھے پایا ہے اب میں تم سے جدا ہونا کبھی گوارا نہیں کروں گا اور تمہیں مجھ سے جدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ تمہیں مجھ سے دور کر سکتے ہیں لیکن جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اسے میری آنکھوں سے نوچ کر باہر نہیں پھینک سکتے۔ گوتم بدھ کو جس درخت تلے گیان حاصل ہوا تھا۔ لوگ اس درخت کو کاٹ سکتے تھے مگر بدھ کا نروان اس سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ میں تجھے کبھی نہیں بھلا سکتا، کبھی اپنے دل و دماغ سے محو نہیں کر سکتا۔ آتش پرستوں کی آگ کی طرح محبت کا یہ شعلہ میرے دل کے معبد میں اب دنیا کے آخری لمحوں تک فروزاں رہے گا۔ بلکہ اس آگ کی جوت میرے ساتھ دوسرے جنم میں بھی جائے گی۔

تم مجھے خط ضرور لکھنا۔ اس لیئے میں تمہاری تحریر پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری باتیں سننا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کی زبان میں گفتگو کرو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم بہت کم سخن ہو۔ مگر تم بے شک خاموشی سے باتیں کیا کرو۔ میں تمہاری خاموشی کی آواز بھی پہچانتا ہوں (جس طرح کہ تمہاری آواز کی خاموشی سے واقف ہوں)۔

آپا مسعودہ نے ہمارے درمیان پیامی بننے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اسے بالکل خبر نہیں کہ وہ

مذاق ہی مذاق میں ایک بہت بڑا فرض ادا کر رہی ہے۔ ایک بہت بڑی خلیج کا پل بن کر اس کے کبھی نہ ملنے والے اور ہمیشہ ملے رہنے والے کناروں کو آپس میں ملا رہی ہے۔ تم بلا کھٹکے انہیں خط دے دیا کرو، میں جو تمہیں اپنا پتہ لکھ رہا ہوں۔ یہ انتہائی محفوظ اور انتہائی قابل اعتماد ہے۔ سعید میرا گہرا اور ایک ہی دوست ہے۔ یہاں سے مجھے تمہارا خط جوں کا توں مل جایا کرے گا۔ تم باجی کو خط دینے کی بجائے اگر خود ڈاک میں دو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ میں بڑی بیتابی سے تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ اس خط میں میں گلاب کے سچے پھول کی چند پتیاں تمہیں بھیج رہا ہوں۔ ان پھولوں میں میری محبت کا دل دھڑک رہا ہے۔

ہمیشہ ہمیشہ تمہارا

"خالد"

میں نے خط لکھ کر سعید کو پڑھ کر سنایا۔ سعید اس محبت میں ظاہر ہے میرا ہمراز تھا۔ وہ سر جھٹک کر بولا۔

"ناممکن ہے کہ کوئی لڑکی ایسا خط پڑھے اور اس سے متاثر نہ ہو۔"

"لیکن سعید میں نے اسے متاثر کرنے کے لیے یہ جال نہیں پھینکا بلکہ یہ تو میرے دل کی عکاسی ہے۔"

"کچھ بھی ہو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"تو ٹھیک ہے اسے متاثر ہونا چاہیے۔"

میں نے لفافے کے باہر باجی مسعودہ کا نام اور پتہ لکھا۔ کونے میں مخصوص نشان بنا دیا۔ ہم دونوں کمپنی باغ کے باہر والے کرسٹل ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ خط کو ہم نے سٹیشن پر جا کر ڈاک کے سپرد کر دیا۔

چار پانچ دن یونہی گزر گئے۔ میں نے مسعودہ کو خط لکھ کر دریافت کیا تو اس نے لکھا کہ وہ خط اسی دن اور اسی طرح ثریا کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

اب میں مزید بیتابی سے خط کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ ساتویں روز سعید شام کو میرے پاس سائیکل پر آیا اور اس نے مجھے زرد رنگ کا ایک لفافہ دیا جس پر زنانہ حروف میں میرا نام اور سعید کا پتا لکھا تھا۔ میں خوشی سے کھل اٹھا۔ "ابھی دفتر سے آیا تو لیٹر بکس میں یہ خط پڑا تھا۔ میرا خیال ہے 4 بجے کی ڈاک سے آیا ہے۔ سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں۔"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھولا، خط سکول کی کاپی پر لکھا گیا تھا اور صرف تین چار سطریں ہی تھیں۔ اوپر میرا نام بالکل نہیں لکھا تھا۔ صرف نیچے چھوٹا سا "ثریا" لکھا تھا۔ میں نے اس مختصر سے خط کو، جو یوں تھا، بار بار پڑھا۔

ان باتوں پر کس طرح یقین لاؤں۔ میں تو اسی دن سے ہر وقت سوچتی رہتی ہوں۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو خواب کی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ بھلا خواب بھی کبھی سچے ہوا کرتے ہیں۔ دل ڈرتا ہے۔ بہت ڈرتا ہے۔

"ثریا"

شاہجہان ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر ہم نے چائے منگوائی اور خط میز پر رکھ کر اس کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ "ظاہر ہے ثریا مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔" سعید نے کہا:

"ورنہ وہ یہ کبھی نہ لکھتی کہ میں تو اسی دن سے ہر وقت سوچتی رہتی ہوں۔ دراصل یہاں وہ یہ لکھنا چاہتی تھی کہ میں اسی دن سے ہر وقت آپ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔"

پھر اس نے لکھا ہے "یہ تو خواب کی باتیں معلوم ہو رہی ہیں"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے یقین نہیں آ رہا کہ کوئی شخص اتنی شدت سے بھی اسے

پیار کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا:۔

"اور یہ جو لکھا ہے کہ دل ڈرتا ہے۔ بہت ڈرتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"اس کا مطلب بالکل واضح ہے۔ وہ محبت کرنے لگی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے اپنی اور گھر والوں کی بدنامی کا بھی خیال ہے۔ وہ ڈرتی ہے کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو مصیبت آجائے گی۔"

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ سعید میری پیالی میں دوسری بار چائے انڈیل رہا تھا۔

"اور میں بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ تم لوگوں کو بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے اگر کسی کو پتہ چل گیا تو اس بیچاری پر تو واقعی بڑی مصیبت آجائے گی۔"

"لیکن اب ملاقات کیسے ہو؟"

"ظاہر ہے اس کے لئے تم کو بٹالے جانا ہوگا۔ تم دو ایک بار وہاں بلا کھٹکے جا سکتے ہو۔ مگر تیسری بار ان لوگوں کو ضرور علم ہو جائے گا کہ تمہاری نیت نیک نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

سعید ہنس پڑا۔

"کوئی ایسا ویسا مطلب نہیں ہے۔ بس مطلب یہ ہے کہ ان پر تمہاری محبت کا راز کھل جائے گا اور پھر تم دونوں کے لیئے ملنا جلنا مشکل ہو جائے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے بدنامی بھی ہو جائے۔

میرا مطلب ہے رشتہ داروں میں۔ اب اگر تم یہ چاہو کہ وہ امرتسر آجائے تو یہ ناممکن ہے۔"

"میں نے مسعودہ کی زبانی سنا تھا کہ مڈل پاس کرنے کے بعد ثریا کے گھر والے اسے میٹرک کروانے کے لئے امرتسر بھیج دیں گے اور یہاں وہ اپنے چچا کے ہاں ٹھہرے گی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔ کم از کم چھ سات ماہ بعد کی ایک امید تو بندھ گئی۔ اس کے چچا صاحب کہاں رہتے ہیں؟"

چوک فرید میں رہتے ہیں۔ ضلع کچہری میں ریڈر ہیں۔"

"تو بھائی ابھی صبر سے کام لو۔ کھیر کو گرم گرم کھانے کی کوشش نہ کرو اسے ذرا ٹھنڈا ہو جانے دو۔"

"لیکن یار میں اسے ملے بغیر رہ نہیں سکتا۔ میں تو آج ہی بٹالے جانا چاہتا ہوں۔"

"بھائی صاحب آج اگر وہاں چلے گئے تو ظاہر ہے اس گھر میں گھسنے سے آپ کو روکے گا کوئی نہیں مگر اتنا سوچ لیں کہ آپ کی بدنامی کا بھی ڈر ہے رشتہ دار کہیں گے کہ جی بہن بھی رقعہ گیری کرتی رہی ہے۔"

"ارے تم لعنت بھیجو یار ان رشتہ داروں پر۔ کم از کم دو ایک بار بٹالے جا کر اپنے دل کی آگ تو ٹھنڈی کر لوں۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ ویسے میری مرضی نہیں ہے۔"

"اچھا بھائی تو جو تمہاری مرضی سو میری مرضی۔"

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا لیکن دل بالکل نہ مانا۔ سعید نے ناصح مشفق بن کر جو اتنی قیمتی باتیں کی تھیں اور مشورے دیئے تھے وہ ثریا کے خوشبودار بالوں اور کانپتے ہوئے گداز بازوؤں کا خیال آتے ہی بھاپ بن کر اڑ گئے اور میں دوسرے ہی روز صبح کی گاڑی سے بٹالے روانہ ہو گیا۔

اس روز شام ہی سے آسمان پر جاڑے کے بوجھل اور سرد بادل چھائے ہوئے تھے اور رات بھر بڑی تیز ہوا چلتی رہی تھی۔ سردی بہت شدید تھی۔ میں نے گھر والوں کو یہ کہہ دیا کہ مسعودہ کے بغیر جی اداس ہو گیا ہے۔ ذرا اس سے ملنے جا رہا ہوں۔ رات کو واپس آجاؤں گا۔ انہوں نے کچھ چیزیں اور پھل کی ایک ٹوکری ساتھ کر دی اور میں گاڑی میں بیٹھ کر بٹالے کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی امرتسر کے مضافات سے نکل کر باہر کھیتوں میں آئی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ تیز زمستانی ہوا گاڑی کے ساتھ ساتھ فراٹے بھرتی چل رہی تھی۔ شیشم کی ٹہنیوں پر تیز ہوا میں خشک پتے گر رہے تھے۔ کاشتکار دہرے کھیس اوپر ڈالے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ایک بوڑھا سوکھی ہوئی ندی کے پل پر چادر اوڑھے ٹھٹھرا ہوا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ بٹالے سٹیشن پر سردی اور تیز ہوا کی وجہ سے بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ سٹیشن ماسٹر اپنے کمرے میں انگیٹھی دہکا کر دبکا بیٹھا تھا۔

قصبے کے مکانوں کے عقب میں گھرے اور یکساں رنگ کے بادلوں کا لحاف سا پھیلا ہوا تھا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ کچی سڑک پر کیچڑ تو نہیں تھا البتہ گرد و غبار اور مٹی ضرور بیٹھ کر سخت ہو گئی تھی۔ فضا میں شیشم کے درختوں اور مٹی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں کھیتوں کھیت ہوتا سیدھا مسعودہ کے ہاں پہنچا۔ لمبی ناک والے دلہا صاحب جن کا نام عابد صاحب تھا اور جنہیں اب میں عابد صاحب ہی کہوں گا اپنے مکان کی گلی میں ہی مل گئے۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ٹوکری اپنے ہاتھ میں تھام کر ساتھ لے گئے۔ مسعودہ اٹھ کر ملی۔ ایک ایک کی خیریت پوچھی۔ پھر میری خیریت پوچھی۔ میں نے کہا:۔

"باجی بس کیا بتاؤں۔ تم سے ملنے کو جی اتنا بے چین ہوا کہ نہ سردی دیکھی نہ بارش اور فوراً گاڑی میں سوار ہو کر یہاں پہنچ گیا۔"

مسعودہ نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا

"وہ تو میں جانتی ہوں کہ تم میرے بغیر بالکل نہیں رہ سکتے۔"

دوپہر کے کھانے تک خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا اور بڑا ہنگامہ رہا۔ مسعودہ نے رات کے کھانے کے لئے بہت سی چیزیں منگوالیں۔ اچھا خاصا پکوان پکنے لگا۔ دو تین بجے کے قریب میں ثریا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ بادل بدستور گھرے ہوئے تھے اور بوندا باندی نے اب ہلکی ہلکی بارش کی پھوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ راستے میں ایک جگہ میں نے دو درجن مالٹے خریدے۔ میں خالی ہاتھ اس گھر میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ ثریا کی گلی میں داخل ہوا تو فرطِ اشتیاق دل سینے میں طائر نو گرفتار کی طرح پھڑکنے لگا۔ مکان کا دروازہ بالکل ویسا ہی تھا۔ محلے میں دوسرے مکانوں کے دروازے بھی تھے۔ مگر اس خاص دروازے میں جو کشش، جاذبیت اور سندرتا تھی وہ کسی دروازے کے حصے میں نہ آئی تھی۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ کسی نے کھڑکی کی چق اٹھا کر نیچے دیکھا۔ میں نے اوپر نگاہ کی۔ ایک ہاتھ سے چق اٹھائے کھڑکی میں ثریا کھڑی تھی۔ وہ مجھے اچانک اپنے دروازے کے سامنے گلی میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے جلدی سے چق گرادی اور پیچھے ہٹ گئی۔ پھوار نے اب ہلکی ہلکی بارش کا روپ دھار لیا تھا اور سردی بے حد ہو گئی تھی۔ میں نے نیلا لمبا گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ پھر بھی سردی سے میری ناک لال ہو رہی تھی اور بال گیلے ہو رہے تھے (اس لئے کہ عادت ہے کہ میں نے آج تک ٹوپی نہیں پہنی) اب میں حیران رہ گیا جب میں نے دیکھا کہ دروازہ ثریا نے کھولا۔

"آیئے۔"

اس نے بڑی گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا اور جلدی سے اوپر بھاگ گئی۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ بات کیا ہے۔ کیا گھر میں اور کوئی نہیں۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر جا کر

دیکھا کہ گھر میں سوائے ثریا کے اور کوئی نہیں۔ دونوں بھائی اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے تھے اور والدہ یعنی خالہ جان اپنی کسی بیمار رشتہ دار عورت کی خبر گیری کو گئی تھیں۔ میں برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ صحن میں بارش کی ٹپاٹپ ہو رہی تھی۔ ثریا سر پر دوپٹہ اوڑھے سر جھکائے میرے بالکل سامنے چولہے کے پاس بیٹھی شلجم کاٹ رہی تھی۔ چند لمحے ہم میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ پھر میں نے مہر سکوت توڑی۔

"خالہ جان کب تک آجائیں گی؟"

"بس آرہی ہوں گی"

ثریا نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا اور شلجم کاٹتی رہی۔ اس نے عام قسم کا پوری آستینوں والا سبز سویٹر پہن رکھا تھا اور بالوں کی ایک لٹ بار بار پھسل کر ماتھے پر آجاتی تھی۔

"میں۔ میں آج ہی امرتسر سے آیا ہوں۔ باجی کے ہاں چلا گیا۔ وہاں سے ہو کر سوچا خالہ جان سے بھی ملتا چلوں۔"

ثریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"خط کے جواب کا بہت بہت شکریہ"

ثریا تھوڑا سا چونکی۔ اس نے یوں سامنے دالان والے دروازے کی طرف دیکھا جیسے کسی نے میری بات سن لی ہو۔ شریف گھریلو لڑکی گھر والوں کی موجودگی میں جی کڑا کر کے آپ سے چھپ چھپا کر محبت کی بات کر سکتی ہے مگر گھر میں کوئی نہ ہو تو وہ بے حد شرمیلی ہو جاتی ہے۔ پھر اسے یوں لگتا ہے جیسے گھر، گھر والوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہی کیفیت اس وقت ثریا کی ہو رہی تھی۔ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سرگوشیوں میں بات کرنے کی بجائے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں جیسے یہ میرا اپنا گھر ہو اور مجھے کسی کی چوری نہ ہو۔ "ارے! یہ تم شلجم کیسے کاٹ رہی ہو۔ اتنے چھوٹے قتلے کون کھائے گا۔"

پھر میں نے کمرے میں جا کر گنگناتے ہوئے آیئنے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں کنگھی پھیری۔ کھڑکی میں سے بارش میں بھیگتے ہوئے کھیتوں درختوں اور پگڈنڈیوں کا نظارا کیا۔ پھر واپس دالان میں آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔

ثریا اب چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔

"بھئی ثریا پہلے چائے کی ایک پیالی پلاؤ۔ پھر کوئی بات کریں گے"

ثریا ذرا سا مسکرائی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے دل سے ڈر دور ہوا ہے۔

"وہی بنانے لگی ہوں"

"اگر چائے بنانی نہیں آتی تو پہلے کہہ دو میں دیہاتی چائے نہیں پیا کرتا۔"

ثریا منہ دوسری طرف منہ کر کے ہنسنے لگی۔

"اپنا ہنستا ہوا چہرہ مجھے نہیں دکھاؤ گی ثریا؟"

میں نے بڑی جذبات بھری آواز میں کہا۔ ثریا ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو کر دہکنے لگیں۔ میں پھر اسی لاابالی موڈ میں آ گیا۔

"بھئی خالہ جان ہوتیں تو ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیتے۔ خیر جیسی بھی ہو گی اب تو پینی ہی پڑے گی۔"

پھر ذرا گھمبیر انداز میں،

"تم اگر زہر بھی دے دو تو کون کافر انکار کرے گا۔"

ثریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اٹھ کر سامنے والے کمرے میں آ گیا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ کھیتوں کی طرف سے سرد اور نمدار ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میری ناک یخ ہو گئی۔ میں سگریٹ جلا کر پینے لگا اور کھڑکی پر پاؤں رکھ کر کوٹ کے کالر چڑھالئے اور باہر کا نظارہ کرتا رہا۔ اتنے میں ثریا اندر آئی اور میرے قریب ہی الماری کا پٹ کھول کر چائے کا ڈبہ اٹھانے لگی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر ثریا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ثریا کانپ اٹھی۔

"چھوڑ دیجیے۔ امی آ جائیں گی۔" "پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"پہلے میری بات کا جواب دو۔"

نہیں نہیں، خدا کے لئے ضد نہ کریں۔"

"میں بالکل نہیں چھوڑوں گا۔ پہلے میری ایک بات کا جواب دو۔"

"خدا کے لئے جلدی پوچھیں۔"

"کیا تمہیں میرا یہاں آنا برا لگا ہے۔"

ثریا نے سر جھکا لیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بتاؤ ثریا۔ کیا میں یہاں نہ آیا کروں؟ --- اگر تم کو میرا آنا اچھا نہیں لگتا تو مجھے کہہ دو۔ میں پھر کبھی تمہیں اپنی بری شکل نہیں دکھاؤں گا۔ پھر کبھی اس گلی میں آ کر تمہارا دروازہ

نہیں تھپتھپاؤں گا۔ پھر کبھی تمہیں چائے بنانے کے لیئے نہیں کہوں گا۔"

ثریا نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ سے شلجم کی ٹھنڈی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ مجھے بالکل ایک دیہاتی لڑکی لگی جو ابھی ابھی مویشیوں کو چارہ ڈال کر آ رہی ہو۔"

"تم بولتی کیوں نہیں ثریا۔ خدا کے لئے کچھ تو کہو --- میرے کان تمہارے جواب کو ترس رہے ہیں --- کیا میرا یہاں چلے آنا تمہیں برا لگا ہے۔ بولو، بولو، --- ثریا۔"

"نہیں۔"

ثریا کے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔ وہ اس وقت شرمانے کی بجائے اپنے مخصوص انداز میں گہری گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"میری ثریا۔"

اتنا کہہ کر میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ثریا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ بالکل عشق پیچاں کی بیل کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ صرف اس کے بازو میرے کندھوں سے مس ہو رہے تھے۔ جانے اس عالم بے خودی میں کتنی صدیوں تک اس کا گلا، رخسار، بازو، آنکھیں پیشانی اور ہونٹ چومتا رہا کہ اچانک وہ تڑپ کر مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور چائے کا ڈبہ اٹھا کر باہر بھاگ گئی۔

میں باہر جانے کی بجائے اندر ہی پلنگ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے اس کیف اور لذت کو ذہن میں دہرانے لگا جو مجھے ابھی ابھی حاصل ہوئی تھی۔ اس ناولوں کے شوقین کی طرح جو کتاب سامنے کھول کر اپنے دل پسند جملوں کو بار بار پڑھتا رہے۔ میں انگلیوں سے اپنے ہونٹوں کو چھو رہا تھا جنہوں نے ابھی ابھی گلزار محبت کے انمول پھولوں کو بوسے دیئے تھے۔ میں اپنے سینے پر ثریا کے گداز جسم کا گرم دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ میرے کانوں میں اس کے تیز تیز سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ میں ثریا کی محبت میں شرابور ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہار میں پورے کھلے ہوئے آلوچے کے پیڑ کی مانند میرے سارے جسم پر پھول ہی پھول کھل گئے ہیں۔ میں انہیں باقاعدہ محسوس کر رہا تھا۔ میں ان پر انگلی رکھ کر کہہ سکتا تھا یہ پہلا پھول ہے۔ یہ دوسرا ہے یہ تیسرا ہے اور یہ پچاسواں ہے اور یہ ہزارواں اور لاکھواں ہے۔ ہر پھول اپنی خوشبو رنگت اور خوبصورتی میں دوسرے سے بلند اور برتر تھا۔ جانے میں کتنی دیر لیٹا رہا کہ ثریا نے دروازے میں کھڑے ہو کر آہستہ سے پوچھا:-

"چائے بھر برآمدے میں لگا دوں یا کمرے میں؟"

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"نہیں نہیں جہاں جی چاہے۔ برآمدے میں ہی لگا دو۔ وہیں ٹھیک ہے، ارے یہ تو بارش شروع ہو گئی۔"

ثریا شلجم پکاتی رہی اور میں برآمدے میں بیٹھا مزے سے چائے پیتا رہا۔ ثریا نے مسکرا کر پوچھا۔

"چائے پسند آئی؟"

"ثریا۔ تم اگر پانی کو کبھی ہاتھ سے چھو دو تو وہ میٹھا ہو جائے گا۔ تم اگر دودھ میں انگلی ڈال دو تو اس میں خوشبو پیدا ہو جائے گی۔"

"پھر تو چائے ضرور خراب ہو گئی ہو گی۔"

ثریا نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اس کی شرارت آمیز مسکراہٹ سے بہت محظوظ ہوا۔

"خراب ہو ہی نہیں سکتی۔ میٹھا زیادہ ہو جاتا تو میرے اندر نمک بہت ہے۔ گھونٹ لیتے ہی برابر ہو جاتا۔"

میں نے چائے کا گھونٹ پیا اور پیالی میز پر رکھ دی۔ سگریٹ جلا کر ثریا سے پوچھا:۔

"ایک بات بتاؤ گی ثریا۔"

"آپ ساری باتیں ایک ساتھ ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے؟"

"پھر تم ایک ساتھ جواب نہ دے سکو گی۔ کیونکہ میری باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے خط کے اوپر میرا نام کیوں نہیں لکھا تھا۔

پہلے تو ثریا نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ پھر میرے اصرار پر اس نے کہا۔

"ڈر لگتا ہے۔"

"میرے نام سے؟"

"اونہوں۔"

"پھر کس سے؟"

"اپنے آپ سے۔"

"میرا نام لکھ دینے میں کیا حرج ہے۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"تو پھر تم نے اپنا نام کیوں لکھ دیا۔ تمہاری تو زیادہ بدنامی ہو سکتی ہے۔"

"مجھے اپنی بدنامی کی پروا نہیں۔"

اتنا کہہ کر ثریا ہنڈیا میں ڈوئی ہلانے لگی۔ ڈوئی ہلا کر وہ چاول تھالی میں ڈال کر انہیں چننے لگی۔ میں ثریا کے جذبۂ ایثار پر حیران ہو کر رہ گیا اس خیال کے ساتھ کہ ثریا مجھ سے محبت کر رہی ہے میرے جذبۂ خود پسندی کو بڑی تسکین ہوئی اور میں نے نیا سگریٹ سلگا لیا۔

اتنے میں ثریا کی والدہ آ گئیں۔ مجھے دیکھ کر بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئیں۔ ثریا سے پوچھنے لگیں کہ اس نے میری کوئی خاطر داری بھی کی یا نہیں؟ گھر والوں کی خیریت پوچھی اور مجھے رات کے کھانے کے لئے زبردستی روک لیا۔ رات کو میرے لئے الگ گوشت بھونا گیا۔ دونوں بیٹے بھی آ گئے اور بڑے پیار اور بڑی وضع داری سے مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد بند کمرے میں بیٹھ کر سماوار میں آگ روشن کر دی گئی اور سبز چائے بنائی جانے لگی۔

میں، ثریا، ثریا کی والدہ اور اس کے دونوں بڑے بھائی سماوار کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ سماوار لکڑی کی ایک اونچی سی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔ ہم سب وہاں بیٹھے گھریلو ماحول کی فضا میں بڑی دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ ثریا نے ڈھکنا اٹھا سماوار میں سبز چائے کی پتی ڈالی تو باہر ایک دم بارش تیز ہو گئی۔ بارش کی آواز سن کر سب خاموش ہو گئے۔ اب بارش کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سردیوں کی انتہائی سرد اور گیلی رات کی کی بارش کتنی پر اسرار ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جاڑوں کی بادلوں بھری گھری سیاہ ٹھنڈی برہنہ رات آموں کے جھنڈ میں بہنے والی نہر میں اکیلی نہا رہی ہو۔ میں نے سماوار کی طرف آنکھیں اٹھا کر اس کے پیچھے ثریا کو دیکھا۔ اس نے سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی اور اس کی شربتی آنکھیں گرم سی ہو کر چمکنے لگی تھیں مجھے یوں لگا گویا جاڑوں کی رات میرے سامنے بیٹھی ہو۔ اس کی پر اسرار نگاہوں میں ایک دل کو خون کر دینے والا بلاوا تھا۔ کمرے میں سردی بڑھ گئی تھی۔

"خوب پانی برسنے لگا بھئی۔"

ثریا کا بڑا بھائی دھسے میں لپٹا لپٹایا بولا۔

خالہ جان نے کہا:-

"یہ بارشیں زمین کے لئے بڑی مفید ہیں۔"

چاولوں کا تاجر بھائی کہنے لگا:-

"کیوں نہیں۔ اگلے موسم میں دھان کی فصل بڑی اچھی ہوگی۔"

مجھے نہ دھان سے لگاؤ تھا اور نہ زمین سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ بارش ہو رہی ہے۔ سماوار میں سبز چائے پک رہی ہے اور ثریا گرم سیاہ شال اوڑھے میرے سامنے بیٹھی ہے۔ یہ رات کی دیوداسی تھی جو سیاہ بالوں میں چاند کا گجرا سجا کر سبز چائے کی پیالی لئے میرے پاس آتی تھی۔ اس رات کی آنکھوں میں کشمیر کی پہاڑی ڈھلانوں پر اگنے والی چائے کی خوشبو اور کمپنی باغ کے گلاب کے پھولوں کی نزاکت اور پاکیزگی تھی۔ یہ سہاگن تھی۔ اس کی مانگ میں کبھی غروب نہ ہونے والی شاموں کا سیندور تھا۔ اس کی آواز میں نئی نویلی دلہنوں کا حجاب تھا اور تروتازہ ہونٹوں پر تازہ دم عاشقوں کے بوسوں کا شہد تھا۔

بارش! بارش!! سردیوں کی بارش!!!

سردیوں کی رات کی بارش!!

کیا یہ پُرخون جوان دلوں کو اپنے ٹھٹھرتے ہوئے سرد ہاتھوں میں لے کر انہیں گر کر دینے والی بارش آج رات نہیں تھمے گی۔؟ کیا مجھے رات ثریا کے گھر میں ہی گزارنی ہوگی۔؟ کیا مجھے یہ ستم بھی دیکھنا ہوگا کہ میں ثریا کے ساتھ والے کمرے میں سوتے ہوئے بھی اس سے لاکھوں میل دور ہوں؟

اگر ان بادلوں کو رات بھر برسنا ہی ہے تو پہلے یہ سارا بٹالہ شہر خالی ہو جائے، ویران ہو جائے۔ پھر ایک پرانے قلعوں ایسی کائی زدہ اونچی اونچی دیواروں والا ایک مکان ہو جس کی لمبی کھلی کھڑکیوں والے کمرے میں صرف میں اور ثریا بیٹھے ہوں۔ ہمارے درمیان سماوار میں خوشبودار سبز چائے سکار رہی ہو، پھولدار کاغذی پیالیاں ہمارے ہاتھوں میں ہوں اور باہر موسلادھار بارش کا شور ہو اور ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں بارش کی آواز سن رہے ہوں اور چائے پی رہے ہوں۔

مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بارش تھمتی کیوں نہیں۔؟

بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔"

خالہ نے کہا:-

"بیٹا پھر کیا ہوا۔ آج رات تم یہیں سو جاؤ صبح چلے جانا۔ اب اتنی بارش میں کہاں گھر جاؤ گے۔"

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور دونوں بھائی ایک ایک کر کے سونے کے لئے چل دیئے تھے۔ جب گیارہ بجے تک بارش نہ رکی تو خالہ نے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں پلنگ ڈلوا کر میرے لئے بستر لگا دیا۔ میں چپکے سے اٹھ کر اس کمرے میں آیا اور کپڑے بدل کر بستر میں گھس گیا۔ بستر جو برف کی طرح سرد ہو رہا تھا بہت جلد میرے جسم کی حرارت سے گرم ہو گیا۔ مجھے نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور قریب ہی رکھی ہوئی میز پر سے ریلوے کا ٹائم ٹیبل اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ روشندان بھی مضبوطی سے بند کر دیئے گئے تھے۔ مجھے اس قدر بند کمرے میں گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے اٹھ کر باہر کھیتوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا اندر آنے لگی۔

اگرچہ کمرے میں سردی بڑھ گئی۔ مگر فضا بڑی خوشگوار ہو گئی۔ اب میں بارش کی صاف ستھری آواز ہی نہیں سن رہا تھا بلکہ باہر والے کھیتوں کے گھاس پودوں کی مختلف خوشبوئیں بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں پھر لحاف میں آ کر گھس گیا اور ٹائم ٹیبل کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ میں فرنٹیئر میل میں پشاور سے بیٹھ گیا اور ابھی گاڑی لاہور کے سٹیشن پر ہی پہنچی تھی کہ آہستہ سے میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ثریا پانی کا گلاس اور گرم شال لے کر آئی۔

"امی نے کہا ہے یہ رکھ لیں۔ رات سردی بہت ہو گی۔"

میں نے ثریا سے کہا:۔

"پانی میرے سر پر ڈال دو اور چادر گلے میں ڈال دو۔"

وہ ہنس پڑی۔

"اوئی اللہ اندر کتنی سردی ہے۔ یہ آپ نے کھڑکی کیوں کھول رکھی ہے"؟

"ارے ارے اسے بند نہ کرنا۔ یہ تو جنت کی کھڑکی ہے۔ یہاں سے تو قدرت کے عنبریں سانس کی خوشبو آ رہی ہے"۔

ثریا بولی:۔

"جناب کہیں شاعری آج کی رات آپ کو مہنگی نہ پڑ جائے۔"

"گھبراؤ نہیں میری جان اگر موت تمہارے گھر میں آتی ہے تو پھر یہ سودا مہنگا نہیں ہے"۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں"۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رات کو آؤ گی ثریا"؟

ثریا خاموش ہو گئی۔ بلکہ کچھ کچھ زرد سی ہو گئی۔

"رات کو؟"

"ہاں ہاں ------ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ ؟"

"ہائے اللہ میں تو مر ہی جاؤں گی۔ نہ بابا میں نہیں آ سکتی"

"تمہیں میری قسم"؟

"اوں نہوں -------------"

"میں بارہ بجے کے بعد انتظار کروں گا"۔

"اوں نہوں ---------"

اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ پیا اور بستر میں گھس کر چھت کی کڑیاں گننے لگا۔ جب ساری کڑیوں کو کوئی ایک سو ایک بار گن چکا تو گھڑی دیکھی۔ پورے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے بتی گل کی اور سگریٹ جلا کر گرم شال سے اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹا۔ بستر میں دبک کر بیٹھ گیا اور بارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس رات جب بارہ بجے تو میرے خیال میں کوئی دو بجے کا عمل ہو گا۔ میں نے ماچس جلا کر دیکھا۔ گھڑی پورے بارہ بجا رہی تھی۔ لیکن یہ ایک گھنٹہ کوئی تین گھنٹوں بلکہ تین سالوں میں گزرا۔ اب میں ہمہ تن گوش ہو گیا اور ہر آہٹ پر کان کھڑے کر دیتا۔ اگرچہ ثریا نے انکار کر دیا تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔

بارش اب مدھم پڑ چکی تھی اور باہر دالان والے چھجوں پر چھت کا پانی ٹپاٹپ کر رہا تھا۔ مجھے ذرا سے کھٹکے پر بھی ثریا کے پاؤں کی چاپ کا گمان ہوتا۔ میں کان کھولے اور آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر بے سود!۔

ایک دو بار میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر باہر صحن میں بھی جھانکا مگر سوائے ویران گیلے فرش اور بارش کی ہلکی ہلکی بوندا بوندی کے اور کچھ نہ تھا۔ برآمدے کے سفید ستون کفن پوش مردوں کی مانند سنسان رات میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ میں نے ایک جھرجھری سی لی اور دروازہ بند کر دیا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

سردی بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے کھیتوں والی کھڑکی بھی بند کر دی تھی۔ جنت کی کھڑکی میں سے اب ہڈیوں کو جما دینے والی سرد ہوا آنے لگی تھی۔

ایکا ایکی مجھے باہر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی یا کم از کم مجھے ایسا ہی لگا۔ میں لپک کر دروازے کی طرف آیا۔ کیواڑ کو ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ میرا خیال درست نکلا۔ ثریا گرم شال میں لپٹی لپٹائی برآمدے میں جھکی کوئی چیز اٹھا کر دوسری جگہ رکھ رہی تھی۔ میرا جی بے اختیار باہر جا کر اس سے لپٹ جانے کو چاہا۔ مگر دل پر جبر کئے وہیں کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا وہ میرے کمرے میں ضرور آئے گی۔

پھر یونہی ہوا۔ برآمدے سے نکل کر ثریا نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میرے کمرے کا رخ کیا۔ میں جلدی سے پرے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ ثریا نے بڑی احتیاط سے کواڑ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہی اسے پھر بند کردیا۔

"میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی"

"اب جو بات کرنی ہے جلدی سے کرلیں ------ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔"

میں نے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے ثریا کا گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ میرے کمرے میں آئی ہو۔ تو کچھ دیر ٹھہرنا ہی پڑے گا۔"

ثریا نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"خدا کے لئے آہستہ بولیں۔"

میں نے انگلی کو چوم لیا۔

"شہادت کی یہ انگلی گواہی دے گی کہ میں تم سے محبت کرتا تھا۔"

"کسی وقت آپ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا"

"فکر نہ کرو۔ یہ تمہاری سمجھ کا قصور نہیں۔ میری باتیں کبھی کبھی عقل کی سرحد عبو جاتی ہیں۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔ تکلف نہ کرو۔ تمہارا اپنا ہی تو گھر ہے یہ۔"

ثریا ہنس پڑی۔ میں نے اسے آہستہ سے پکڑ کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھلا لیا۔

"جب تم ہنستی ہو تو تمہارے دانت ان موتیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو سیپ میں بند ہوتے ہیں۔"

"آج تو میں نے داتن بھی نہیں کیا۔ صرف کوئلے کا منجن ہی کیا ہے۔"

"کوئلہ کیکر کا تھا یا پتھر کا؟"

ثریا نے مسکرا کر کہا۔

"کیکر کا تھا۔ بجھا ہوا تھا۔"

"سمجھ گیا۔ سافٹ کوک تھا۔"

"کیا یہی بات مجھ سے پوچھنی تھی؟ اچھا تو اب جاتی ہوں۔"

میں نے ثریا کی کلائی پکڑ لی۔

"میں کوئلے کے ٹال سے ہو کر پھولوں کی دکان پر آنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب جبکہ قلم چل گئی ہے، قسمتوں کے فیصلے ہوگئے ہیں محبت نے اپنے علم بلند کردیئے ہیں، اب ہم کیا کریں؟ کیا ہم محبت کو خانہ بدوش قافلہ خیال کرلیں جس کی گھنٹیوں کی آواز صحرا کی چاندنی راتوں میں تھوڑی دیر کے لئے گونجتی ہے اور پھر غائب ہوجاتی ہے؟ کیا ہم اسے وہ کشتی سمجھیں جو گھاٹ پر بڑی تیزی سے روانہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک بار جب گرداب میں پھنس جاتی ہے تو پھر کبھی نہیں نکلتی؟ بتاؤ ثریا! اب جو ہم نے محبت کا تلک لگا لیا ہے تو کیا ہمیں ایک دن اکٹھے جدائی کی چتا پرستی ہونا پڑے گا؟"

ثریا نے سر جھکا لیا تھا اور بڑی گہری خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی پر اسرار آنکھیں اٹھا کر مجھے ساکت نگاہوں سے دیکھا۔ ان آنکھوں میں آہنی عزم کی جھلک تھی۔

"بولو------ بولو ثریا! کیا کسی روز ایسا تو نہیں ہوگا۔ میں پہاڑوں میں سے نہر کاٹ رہا ہوں گا اور مجھے کسی بادشاہ سے تمہاری شادی کی اندوہناک خبر ملے گی۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں ثریا میں فرہاد کی طرح کلہاڑے سے اپنا سر نہیں پھوڑوں گا بلکہ خبر لانے والے کو ہلاک کردوں گا۔ میں محبت میں ہر چیز برداشت کرسکتا ہوں مگر اپنی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ کیا ایک دن تم بھی مجھے چھوڑ کر چلی تو نہیں جاؤ گی؟ بولو تم چپ کیوں ہو؟"

ثریا نے پھر سر جھکا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔ میرے سارے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ثریا اس سے مدلل جواب اور کیا دے سکتی تھی۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ کانپ گئی اور اس نے دھیمی سی سسکی بھری۔ اس کے ان چھوٹے ترو تازہ ہونٹوں سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یہ خوشبو گلاب کے پھول کے ڈنٹھل کی مہک سے بڑی ملتی جلتی تھی۔ اب میرے پیاسے ہونٹ اس کے رخساروں سے ہو کر بالوں کو پیار کر رہے تھے۔ ثریا کے بالوں میں ناریل کے تیل کی ہلکی ہلکی خوشبو تھی۔ اس خوشبو نے لنکا کے ناریل کے جھنڈوں کی یاد تازہ کردی تھی۔ میں نے موسلادھار بارش میں کولمبو کے سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے ناریل کی شاخوں کو طوفانی ہواؤں میں جھومتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک لڑکی

دیکھی۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی۔ اس کی سرخ ساڑھی اس کے چھریرے بدن سے چمٹ گئی تو
اور وہ ناریل کی چھال سمیٹ کر ایک جھونپڑی کے اندر لے جا رہی تھی۔ ایک ننھا سا کالا کلوٹا
ننگ دھڑنگ لڑکا، جس کی کمر کے گرد سیاہ دھاگا بندھا ہوا تھا، زرد کیلوں کا گچھا سر پر اٹھائے
بھاگتا ہوا ایک دوسری جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

اب بانس کے گنجان جنگل تھے۔ سبز اور براؤن بانس کے جھنڈوں کے جھنڈ بارش
میں بھیگ رہے تھے اور اوپر سے آنے والے برساتی نالے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا
دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ اس خوفناک طوفان باد و باراں میں ایک سیاہ بالوں والی دبلی سی سانولی
لڑکی جس کے پاؤں میں چاندی کی پائل تھی اور جس کے جوڑے میں گل مہر کا ایک پھول
تھا کسی مضافاتی سٹیشن کے سرخ بجری والے ویران پلیٹ فارم پر ماتھے پر ہاتھ رکھے جنگل کی
طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کی پیشانی کا گہرا سرخ تلک انار کے پھول کی طرح لَو دے رہا تھا۔ جنگل میں
جانے والا راستہ بالکل سنسان تھا اور بارش میں بھیگ رہا تھا۔ کیا اس راستے سے چل کر کوئی
اس لڑکی سے ملنے آئے گا؟ کیا یہ لڑکی ساری عمر اس پلیٹ فارم پر جوڑے میں پھول لگائے
کھڑی رہے گی؟

میں نے ثریا کے بالوں میں منہ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب ناریل کے تمام
درختوں کو نیند آ گئی تھی اور ملایا کی جانب سے-----

"اب میں جاتی ہوں"

ثریا کے اس جملے نے میرے خیالات کا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔

"نہیں نہیں ثریا۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو رات ہے، بہت"

باہر پھر بارش تیز ہو گئی۔ ثریا نے ایک جھرجھری سی لی اور میرے ساتھ لگ گئی۔

"ثریا تم امرتسر پڑھنے کب آ رہی ہو؟"

"شاید اگلے سال آ جاؤں"

"اگلے سال؟"

"میرا مطلب ہے ان گرمیوں میں، جب سکولوں کا داخلہ شروع ہو گا"

"میں اس وقت کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔ ثریا جب تم امرتسر آ کر رہو گی۔

تمہیں مجھ سے روز ملنا ہو گا۔"

"ہائے اللہ! وہاں کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت ہی آ جائے گی۔"

میں نے دونوں ہاتھوں میں ثریا کا چہرہ تھام لیا۔

"تم لوگوں سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ لوگ تمہارا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"وہ ہمیں بدنام کر دیں گے۔ پھر میری امی اور بھائی کو بڑا دکھ ہو گا اور وہ مجھے امرتسر
سے واپس یہاں منگوا لیں گے۔"

"ہم محتاط رہیں گے ایسا وقت نہیں آئے گا۔ اچھا دیکھو میرے خط کا جواب ذرا
تفصیل سے دیا کرو۔ اگر مختصر جواب آیا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔ پھر میں تم سے
کبھی نہیں ملوں گا۔"

ثریا نے ایسے مجھے دیکھا جیسے اسے میری اس بات سے صدمہ ہوا ہو۔ میں حیران تھا کہ
یہ لڑکی مجھ سے اس قدر محبت کرنے کے باوجود زبان سے محبت کا اقرار نہیں کر رہی تھی۔
تاہم میں جانتا تھا کہ اس قسم کی لڑکیاں بڑی دیر بعد جا کر کہیں حرف محبت زبان پر لاتی ہیں۔
اس لئے میں نے ثریا کو بالکل مجبور نہ کیا کہ وہ اپنی طرف سے سے بھی محبت کا اظہار کرے۔

"باجی مسعودہ صرف ڈیڑھ ایک ہفتہ اور یہاں ہے۔ پھر وہ اپنے خاوند کے ساتھ کراچی
چلی جائے گی۔ اس کے بعد میرا صرف تم لوگوں سے ملنے یہاں آنا مناسب نہ ہو گا۔ پھر
صرف خط ہی تسکین دل کا ذریعہ ہو گا۔ اگر تم نے بار بار خط نہ لکھا تو مجھ سے تمہاری جدائی
برداشت نہیں ہو گی۔ وعدہ کرو کہ تم میرے خط کا فوراً جواب دیا کرو گی۔"

"وعدہ کرتی ہوں مگر جب باجی یہاں نہیں ہو گی تو پھر مجھے خط کون لا کر دے گا؟"

"اس کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔"

بندوبست یہ ہوا تھا کہ مسعودہ کی بٹالے میں ایک لڑکی بڑی گہری سہیلی بن گئی تھی۔
یہ لڑکی ایک ہسپتال میں نرس تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ میں ثریا کے نام خط اس نرس کو، جس کا
نام نجمہ تھا، لکھوں اور میرا لفافہ وہ جوں کا توں ثریا کو پہنچا دیا کرے۔

"اس سلسلے میں تمہیں دوسرے تیسرے ہسپتال کا پھیرا ضرور مارنا پڑے گا۔"

"اچھا!"

ثریا نے آہستہ سے کہا اور پھر چپ ہو گئی۔

"میں صبح نو بجے کی گاڑی سے واپس امرتسر جا رہا ہوں۔ شاید اب دیر بعد ملاقات ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے گھر والوں کو ہمارے متعلق ذرا سا شبہ بھی ہو۔ یہ لوگ میری بے حد عزت کرتے ہیں۔ اگر میں بار بار یہاں آتا رہا تو انسان کے دل میں خوامخواہ خیال پیدا ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے میں باجی مسعودہ کے کراچی جانے سے پہلے ایک بار تمہیں آ کر مل جاؤں۔ اب تم جا کر سو رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کی آنکھ کھل جائے۔"

میں نے ثریا کو لپٹا کر پیار کیا اور آنکھوں کو چوم کر خدا حافظ کہا۔ ثریا کہاں تو چلنے کے لئے خود کہہ رہی تھی اور کہاں یہ کہ اب اس کے پاؤں منوں بھاری ہو رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کمرے کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ مگر مجبوراً اسے جانا پڑا۔ اس نے بڑی افسردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ شاید اس کی آنکھیں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ کیونکہ جب میں داوازے میں اس کا الوداعی بوسہ لینے لگا تو میری پیشانی کو آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے تعجب سے ثریا کی طرف دیکھا۔

"یہ آنسو کیوں ثریا؟ یہ خزاں سے پہلے ہی پت جھڑ کیسے شروع ہو گئی؟ ابھی تو شگوفوں کو کھل کر پھول بننا ہے، ابھی پھولوں کو اپنی جوانی کے عروج پر پہنچنا ہے۔ یہ آنسو پونچھ لو۔"

میں نے ثریا ہی کی گرم شال سے اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور اس کی گیلی پلکوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ دوسرے لمحے ثریا جا چکی تھی۔

ثریا کے چلے جانے کے بعد کتنی ہی دیر مجھے نیند نہ آئی۔

دوسرے روز میں بٹالے سے امرتسر پہنچ گیا۔ سعید کو میں نے پوری روئیداد سنائی۔ اس نے پھر ناصح مشفق بن کر مشورہ دیا کہ میں خط کم ہی لکھا کروں۔ مگر میں پَر لگا کر ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ میری خاک جگنو بن کر محو پرواز تھی۔ میں نے اسی روز رات کو اپنی شہ نشین میں بیٹھ کر ثریا کو ایک لمبا چوڑا خط لکھ ڈالا۔

"میرے جنگلوں کی بارش!

تم سے جدا ہو کر پھر کسی سے نہیں مل سکا۔ پھر کہیں دل نہیں لگ سکا۔ یہاں بھی بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تم سے ملے آج دوسری رات ہے۔ دل اس تقریب کو پھر زندہ کرنا چاہتا ہے۔ بارش کے انہی جنگلوں میں ایک رات اور گزارنا چاہتا ہوں۔ ایک بار پھر تمہارے بالوں میں اپنا منہ چھپا کر کولمبو اور رنگوں کے ناریل کے جھنڈوں میں کھو کر طوفانی سمندروں کی غضبناک آوازیں سننا چاہتا ہوں کل رات کی طرح آج بھی بارش ہو رہی ہے۔ میں تمہارے کمرے کی جگہ اپنے گھر کی شہ نشین میں بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ میں پلنگ پر الماری سے ٹیک لگائے تمہیں یاد کر رہا ہوں۔

کل رات جب تم نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما تو مجھے اپنی طاقت اور بھرپور اعتماد کا احساس ہوا۔ پھر تم نے اپنا خوبصورت بالوں والا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور میں نے بڑی مدت کے بعد شام کی نرم ہوا میں معصوم چڑیوں کی چہکار سنی، خوشبودار وادیوں کے کچے راستوں پر گھروں کو لوٹتے ہوئے چرواہوں کے الوداعی گیت سنے۔ سنہری دھوپ میں ہری بھری چمکیلی گھاس پر دوڑتے ہوئے سفید ابر پاروں ایسے خرگوش دیکھے۔

شہ نشین خاموش ہے۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ یہ ہوا شریف پورے کے باغوں سے ہو کر آ رہی ہے اور اپنے دامن میں آلوچوں اور امرودوں کی تازہ خوشبو بھی لا رہی ہے۔ میں تمہیں بال کھولے گرم شال سے جسم لپیٹے اپنے سامنے بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی ہے۔

گلی میں سردیوں کی بارش کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بارش کبھی نہ رکے۔ یہ سرمئی بادلوں سے گرتی ہوئی موتیوں کی لڑیاں سدا گرتی رہیں اور میں اپنے تصور میں کولمبو کے نیلے تالابوں میں کھلے ہوئے کنول کے سفید دودھیا پھولوں پر پڑے ہوئے بارش کے موتیوں کو آنکھوں سے لگاتا رہوں۔

ثریا! میرا ذہن مجھے عجیب عجیب قسم کی تصویریں دکھا رہا ہے۔ ان تصویروں میں تم کہیں نہیں ہو۔ مگر تم ہر تصویر پر چھائی ہوئی ہو۔ یہ بارش، محبت سے بھرا دل، گرم خون کی نالی پر دھڑکتا ہوا جواں دل، اور جدائی کے خیال سے نم آنکھیں!

میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک کم سن لڑکا باجہ گلے میں ڈالے بانس کے ایک پل پر سے گزر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک کالی کالی آنکھوں والی چھوٹی لڑکی بھی ہے۔ دونوں اپنی پتلی پتلی اور من موہ لینے والی آواز میں بنگال کا کوئی پرانا گیت گا رہے ہیں۔ لڑکا ہامونیم بجا رہا ہے اور شرمیلی لڑکی جھولی پھیلائے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر کلکتہ شہر میں آئے ہیں۔ ناریل اور کیلے کے درختوں والے شہر میں آئے ہیں۔ پل کے نیچے گہرا نیلا پانی بہہ رہا ہے۔

اس میں سبز اور چوڑے چوڑے پتے تیر رہے ہیں۔ ان پتوں میں کہیں کہیں کنول کے پھول کھل رہے ہیں۔ یہ ماہی گیروں کی بستی ہے۔ تالاب کی بائیں جانب ان کی جھونپڑیاں ناریل اور کیلے کے درختوں کا گھونگھٹ کاڑھے صبح کی سہانی ہوا میں خاموش کھڑی ہیں۔

اب ایک اور تصویر سامنے آتی ہے۔ جنگل میں طوفان کا جھکڑ چل رہا ہے اور گرانڈیل اور مضبوط درخت زمین کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ ہواؤں کے تھپیڑے سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ اس ہنگامہ خیز ماحول میں ایک آواز رہ رہ کر ابھر رہی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی دکھی انسان بڑی دردمندی کے ساتھ ان درختوں، ہواؤں کنول کے پھولوں اور ناریل کے جھنڈوں سے اپنی کھوئی ہوئی محبت کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔

اب میں ہرے بھرے بانس کے گھنے جنگلوں میں ہوں۔ جہاں بارش کی ٹھنڈی اور مسلسل جھڑی لگ رہی ہے۔ ساکن جھیلوں کی نیلی سطح پر مقدس کنول کے سفید پھول اپنے معصوم مکھڑے آسمان کی طرف اٹھائے نیلے آکاش کو تک رہے ہیں۔

ثریا! میرے اور قریب آجاؤ۔

اب میں تمہیں ایک بہت ہی دردناک گیت سنا رہا ہوں۔

پرانے کائی لگے کناروں والے تالاب کے کنارے، جس کی سطح پر جھکے ہوئے درختوں کے ٹھنڈے اور گھنے سائے ہیں۔ ایک کشتی سیڑھیوں کے پاس کھڑی ہے۔ اس

کشتی میں حسین نرتکی اپنی بڑی بڑی ہرنیوں ایسی آنکھوں میں آنسو لئے سوار ہے اور اس کا محبوب سوگوار ہو کر قریب ہی کنارے پر کھڑا ہے۔ نرتکی کی سکھیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی سفید جالیوں کے پیچھے اپنی کالی آنکھوں سے آنسو بہاتیں الوداعی گیت گا رہی ہیں۔

گیت کے مدھر اور اداس بول سکھیوں کے ہونٹوں پر سے آنسوؤں کے قطرے بن کر گر رہے ہیں۔ ہری بھری بیلیں غم سے نڈھال ہو کر دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی ہیں۔ اور اپنے پھولوں بھرے نازک نازک بازو پھیلا کر نرتکی کو واپس بلا رہی ہیں، سنو!

سکھیوں میں باتیں ہوتی ہیں
لپٹ لپٹ بیلیں روتی ہیں
شاخیں ہاتھ ہلاتی ہیں-----
کیا ہمیں واپس بلاتی ہیں

اور گیت کی مدھم لے پر کشتی اور اس میں بیٹھی ہوئی ماٹلی پتر کی شاہی نرتکی اپنے ساجن سے اور دردمند دلوں والی سکھیوں سے دور ہوتی جا رہی ہیں-----"

ثریا! میرے دل کے نہاں خانوں میں جہاں، اب تمہاری محبت نے اپنے گھیرے سائے کر رکھے ہیں، ایسے کئی گیتوں کی صدائے بازگشت بھٹکتی رہتی ہے۔ ان گیتوں کو سن کر مجھے ہمیشہ اکیاب میں کیلوں سے لدے ہوئے تالاب یاد آجاتے ہیں۔ جس شاہانہ ٹھاٹھ اور عظمت کے ساتھ میں نے وہاں سورج کو طلوع ہوتے دیکھا۔ پھر ویسا سورج کبھی طلوع ہوتے نہیں دیکھ سکا۔ جب اراکان کے مشرقی پہاڑوں کے سلسلے کے عقب سے سورج کا سرخ سرخ تھال نمودار ہوتا تو میں اکیاب کے ساحلی علاقوں میں سیر کے لئے نکل جاتا۔ یہاں ایک سڑک ہوا کرتی تھی جس کی دونوں جانب اناناس اور کیلوں کے بڑے وسیع باغات تھے۔ کیلے کے کومل تروتازہ ہرے بھرے پتے صبح کی ہوا میں جھوما کرتے۔ میں سورج کی اولین کرنوں کے سامنے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جاتا اور کتنی ہی دیر تک کھڑا رہتا۔ مجھے کبھی گل مہر اور کبھی مولسری کے پھولوں اور کبھی کچے کیلوں اور کبھی اناناس کی رس بھری میٹھی خوشبو محسوس ہوتی۔

میں اپنا آپ اس قدر ہلکا محسوس کرتا جیسے میں ہوا میں اڑا جا رہا ہوں۔ یہاں جیٹی کے دوسری جانب ایک بڑی لمبی چوڑی جھیل تھی۔ یہ جھیل کنول کے بڑے بڑے پھولوں سے

اٹی رہتی تھی۔ کنارے کنارے تاڑ کے درختوں کی قطاریں اس پر جھکی رہتیں۔ جب دھوپ نکلتی تو جھیل کی سطح پر ان درختوں کا عکس لرزنے لگتا۔ پھر جب گھرے سیاہ بادل گھٹائیں بن کر امڈ آتے تو ان درختوں کے نوکیلے پتے ہوا میں جھولنے لگتے۔ پرندوں کے گیت زیادہ بلند ہوجاتے اور پھر بارش شروع ہو جاتی۔ ناریل اور کیلوں کے درختوں پر بارش کی جلترنگ سی بجنے لگتی۔ گھنے درختوں کے جھنڈوں میں پہاڑی کی ڈھلانوں پر کوٹھیوں کی سرخ چھتیں زیادہ شوخ ہوجاتیں۔ پت جھڑ کے دنوں میں یہاں ایک جنگلی سڑک پر ساگوان کے اونچے اونچے درختوں کے پتے خشک ہو کر سرخ ہو جاتے اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ گرنا شروع ہو جاتے۔ یہ راستہ سرخ سرخ جھڑے ہوئے پتوں سے ڈھکا رہتا۔

میں جس دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اس کا کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ فرش لکڑی کا تھا۔ وہاں ہم نے بستر لگا رکھے تھے۔ برسات گزر جاتی تو ہم اپنے ساتھ شکار کا سامان لے جاتے اور دریا کنارے چھوٹی سی جھونپڑی میں سامان رکھ دیتے۔ یہ لڑکا بنگالی تھا اور بہت اچھا گا لیتا تھا۔

پھر میں اس لڑکے سے دلی میں تیمار پور والی بستی میں ملا۔ یہاں یہ دلی ریڈیو پر ملازم ہوگیا تھا۔ جب کبھی میں اس سے ملنے جاتا تو ہم برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہوتی۔ ہمارے سامنے والے ٹیلے پر کیکر اور جامن کے درخت ہوا میں جھوم رہے ہوتے۔ نیم کے درختوں پر دھوبیوں کی کم سن لڑکیوں نے جھولے ڈالے ہوتے اور وہ ساونی گا رہی ہوتیں۔

ثریا ان دنوں کی یادیں تم سے مل کر ایک بار پھر زندہ ہو گئی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے زندگی اپنا سنہری دور ایک بار پھر دہرا رہی ہے۔ وقت کا چکر پیچھے کو چلنے لگا ہے اور سنے ہوئے گیتوں کی صدائیں ایک بار پھر سنائی دے رہی ہیں۔ دیکھے ہوئے پھولوں کی خوشبو بھری لہریں ایک بار پھر فضا میں اڑنے لگی ہیں۔ خط بند کرنے سے پہلے ایک بار پھر یہ کہوں گا کہ تم ہی میری زندگی کا سنگیت، میرے پھولوں کی خوشبو اور میرے آسمان کا آفتاب ہو۔

میں تمہارے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارا

خالد

اب ہماری خط و کتابت باقاعدہ شروع ہو گئی۔

ثریا اگرچہ زیادہ لمبے خط نہ لکھتی۔ تاہم وہ خطوں میں اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کرتی۔ مثلاً وہ اب صاف صاف لکھ دیتی کہ میرے بغیر بہت اداس ہے۔ کیا پھر بھی ہماری ملاقات ہوگی؟ کہیں اب یہ جدائی مستقل تو نہیں ہو گئی۔ میں کب بٹالے آؤں گا؟

اس طرح چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں مجھے دو ایک بار بٹالے بھی جانا پڑا۔ مگر بڑی احتیاط کے ساتھ خالہ کے گھر جا کر ان لوگوں سے ملا اور جلدی یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ میں دراصل پٹھانکوٹ گیا ہوا تھا۔ تو سوچا خالہ کو بھی مل لوں۔ اب میں ایک دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ یہ دفتر لاہور کا ریلوے ہیڈ کوارٹر تھا۔ سعید کے ساتھ میں نے بھی ریلوے کا رعایتی پاس بنوا لیا تھا۔ اور صبح ریل کے ذریعے امرتسر سے لاہور جاتا اور تیسرے پہر بابو ٹرین میں بیٹھ کر واپس گھر آ جاتا۔

دفتر کی نوکری یونہی والدہ کی خوشنودی کے لئے کی تھی ورنہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں مہینے میں دس دن دفتر سے غیر حاضر رہا۔ ہمارے ساتھ امرتسر کے لوگ بھی لاہور مختلف دفتروں میں نوکری کے لئے جایا کرتے۔ ان میں بعض ریلوے کے ملازم تھے اور بعض دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں کام کرتے تھے۔ ریلوے کے ملازمین کا ماہواری پاس سوا تین روپے کا بنتا تھا۔ دوسرے ملازموں کو ساڑھے بارہ روپے دینے پڑتے۔

چنانچہ ان میں سے اکثر بغیر ٹکٹ کے ہی سفر کرتے۔ ان میں دو تین بڑے مدبّر قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے عام ٹکٹ چیکروں سے یارانہ گانٹھ لیا تھا۔ مگر ہیڈ کوارٹر کے ٹکٹ چیکروں کا گروپ جب کبھی چھاپہ مارتا تو ان پر مصیبت نازل ہو جاتی۔ پھر یہ لوگ ہم ریلوے ملازموں کے ڈبوں میں گھس آتے۔ کبھی پچھلے سٹیشن پر ہی اتر جاتے اور کبھی غسل خانوں میں گھس کر چھپ جاتے۔ میں سٹورز ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا۔ میں نے جس آدمی کی سیٹ کا چارج لیا وہ کوئی میرا ہی بھائی بند تھا۔ وہ فائیلوں کا ایک انبار اپنی میز پر چھوڑ گیا تھا۔

کچھ روز تو میں نے ان فائیلوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ بس میز پر بیٹھا ریلوے کے خوبصورت پیلے کاغذوں پر ثریا کو خط لکھتا رہتا۔ جب ہیڈ کلرک لالہ پرشوتم داس نے سیٹ کلیر

کرنے کا نوٹس دے دیا تو میں نے کام شروع کر دیا۔ کام اس طرح شروع کیا کچھ فائیلوں پر تو غلط سلط نوٹ لکھ کر فارورڈ کر دیا۔ اور جو باقی بچیں انہیں فائلوں کے ایک بہت بڑے چھت تک گئے ہوئے ریک کے پیچھے پھینک دیا۔

مجھے یاد ہے ایک کیس میرے پاس آیا جسے میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ کیس تھا کہ نگروٹا ریلوے کے لیے ریلوے نے ٹینڈر طلب کیے ہیں۔ یہ ٹینڈر کس حساب سے طلب کئے جائیں کہ ریلوے کو نقصان بھی نہ ہو اور شرح فی صد اتنی بھی نہ بڑھ جائے کہ ٹھیکیدار اسے اٹھانے ہی سے انکار کر دیں۔ میں نے لاکھ سر مارا لیکن میں مناسب شرح نہ نکال سکا۔ یہ تو بالکل حساب کا سوال تھا جو میں نے سکول میں بھی کبھی حل نہ کیا تھا بلکہ ہمیشہ نقل مار کر کام چلایا تھا۔ یہ کیس ایک ہفتہ تک میرے پاس پڑا رہا۔ ساتویں روز اس کا نوٹس آگیا۔ میں اسے حل کرنے ہی والا تھا یعنی ارادہ کر لیا تھا کہ آج اسے بھی دوسری حل شدہ فائلوں کے پاس ریک کے پیچھے پہنچا دوں گا کہ ہیڈ کلرک صاحب اٹھ کر میری سیٹ پر آگئے اور فائل ہاتھ میں لے کر بولے:

"بٹ صاحب اس کیس کا کیا بنے گا؟"

میں نے کہا:

"لالہ جی جوتا بنوالیں۔"

لالہ جی ہنس پڑے۔ بڑے ہنس مکھ انسان تھے۔ بہت دیر تک مجھے سلیپروں کی شرح کے بارے میں پرانی فائیلوں کا حساب نکال کر سمجھاتے رہے۔ سمجھاتے سمجھاتے وہ خود بھی الجھ گئے اور بولے،

"یار یہ کوئی بڑا کڈھب کیس ہے۔ چھوڑو اسے میں خود دیکھ لوں گا۔"

اس طرح وہ فائیل میرے ہاتھوں حل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اب کیا ہوا کہ جو فائیل میں ریک کے پیچھے پھینک چکا تھا اور جن کی تعداد میرے اندازے کے مطابق دس گیارہ سے کم نہ تھی ان میں ایک فائیل بڑا کونفیڈنیشل تھا۔

جب ہر سیٹ کی ایک ایک فائل گم ہو گئی تو دفتر میں شور مچ گیا کہ آخر فائیل گئے تو کہاں گئے۔ میں نے کہا۔

"لالہ جی میں نے تو اسی روز کیس فارورڈ کر دیئے تھے۔"

درپردہ میں نے ایک روز دفتر کے وقت سے پہلے آکر فائیلوں کو ریک کے پیچھے سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر وہ تو جیسے اندھے کنوئیں میں گر چکے تھے:

نتیجہ یہ ہوا کہ میرا ایکسپلانیشن کال ہو گیا۔ آفیسر کے سامنے پیشی ہوئی، اس نے پوچھا:۔

"فائیل کہاں ہیں۔"

میں نے کہا:۔

"کون سے فائیل زناب؟"

کہنے لگے!

"جو آپ کی میز پر پڑے تھے۔"

میں نے کہا۔

"فارورڈ کر دیئے گئے۔"

"کہاں؟ کس کو؟"

"متعلقہ لوگوں کو۔"

"مگر انہیں تو نہیں ملے۔"

"مگر میں نے تو دے دئیے تھے۔"

"پھر کہاں گئے؟"

"خدا جانے زناب کہاں گئے۔"

اس بک بک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے نوکری سے جواب مل گیا۔ میں نے اپنی آخری تنخواہ اور برخاستگی کی چھٹی وصول کی اور سعید کو ساتھ لے کر لاہور کی میکلوڈ روڈ کے ایک شاندار ہوٹل میں آکر خوب چائے پیسٹری اڑائی چھٹی میں نے وہیں پھاڑ کر پھینک دی اور تنخواہ کے روپوں میں سے ثریا کے لئے ایک ریشمی رومال اور امریکن انگوٹھی خریدی۔ گھر والوں سے کہا کہ میرا افسر سے جھگڑا ہو گیا ہے اور میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ والد صاحب نے کہا:

"بات کیا ہوئی تھی؟"

میں نے کہا۔

"بس کچھ نہیں۔ کہنے لگا تم میز پر ٹانگیں رکھ کر کیوں بیٹھتے ہو۔ میں نے کہا زناب پر کیا ہو گیا۔ کہنے لگا تم ایڈیٹ ہو۔ پھر میں نے بھی اسے بھی گالیاں دیں۔ اس نے مجھے برخاست کر دیا۔"

والد صاحب بولے۔

"اس کتے کی مرمت کرنی تھی۔ وہ ایڈیٹ کہنے والا کون تھا۔ میں نے تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ تم سے نوکری نہیں ہو گی۔ اس بک بک کو چھوڑو اور میرے ساتھ کلکتے چل کر اپنا کام شروع کرو۔"

مگر میں اس وقت امرتسر کو کیسے چھوڑ سکتا تھا جبکہ چند ہی دنوں میں ثریا وہاں آنے والی تھی۔ ستمبر کے مہینے میں ثریا بٹالے سے امرتسر آ گئی اور چوک فرید میں اپنے چچا کے ہاں رہنے لگی۔ اس کے چچا کے ہاں جانا تو میرے لئے مناسب نہ تھا۔ میں نے چھوٹی بہن مریم کو کسی بہانے سے راضی کر لیا اور ہم دونوں اس کے ہاں پہنچ گئے۔"

میں ثریا کو تین ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر بڑی دلکشی اور رونق آ گئی تھی۔ وہاں ہمیں زیادہ باتوں کا بالکل موقع نہ ملا۔ صرف یہ خبر مل گئی کہ اگلے ہفتے وہ سکول میں داخلہ لے رہی ہے۔

ثریا مال روڈ یعنی کمپنی باغ والے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں داخل ہو گئی۔ یہ سکول مال روڈ پر کمپنی باغ کے شمالی کونے پر واقع تھا۔ وکٹوریہ ہسپتال کے اونچے پل والے گیٹ سے اگر ہم مال کی جانب چلیں تو یہ پہلے چوک میں پڑتا تھا۔ اس لمبی سڑک پر کوئی دکان یا مکان نہ تھا۔ صرف شروع میں ایک انگریزی وضع کا رہائشی ہوٹل تھا۔ سارا راستہ یوکلپٹس کے درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ آگے جا کر "پربھات" نام کا ایک فوٹو سٹوڈیو تھا۔ ہندو لڑکیوں کا ایک سکول تھا۔ اور پھر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی کوٹھی نما عمارت آ جاتی تھی۔ جو سڑک سے ذراہٹ کر اندر جا کر تھی۔ ثریا پہلے ہی روز سکول گئی تو میں دروازے پر اس کا انتظار کر رہا تھا اس نے نسواری رنگ کا ریشمی برقعہ اوڑھ رکھا تھا اور ہاتھ میں کتابیں کاپیاں اور ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی۔ وہ میرے پاس آ کر رک گئی اور نقاب اٹھائے بغیر بولی،

"ہائے اللہ آپ بڑے وہ ہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔"

"گھبراؤ نہیں بابا۔ یہ ہمارا شہر ہے، یہاں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا"

ثریا گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"نہیں نہیں ابھی نہیں۔ میں کل ملوں گی۔ آپ کل چھٹی کے وقت آ جائیں۔"

دوسرے روز میں اور سعید کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہی کمپنی باغ میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر باغ کی سیر کی۔ پھر کرسٹل ہوٹل میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی۔ جب ثریا کے سکول میں چھٹی کا وقت ہوا تو سعید واپس چلا گیا اور میں سکول کے گیٹ سے ذرا فاصلے پر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چھٹی کی گھنٹی بجی اور ہندو، مسلمان، سکھ لڑکیاں باہر نکلنا شروع ہو گئیں۔ کسی کو لینے کے لیے تانگہ کھڑا تھا، کسی کے لیے کار آئی ہوئی تھی۔ لڑکیاں اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھ کر گھروں کی طرف روانہ گئیں۔

میری نظریں ثریا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اپنی سکول کی چند ایک مسلمان لڑکیوں کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر سڑک پر آگے آگے چل پڑا۔ الیگزنڈرا پارک کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ یہاں ثریا بھی میرے ساتھ آ کر مل گئی۔

اب ہم نے سڑک چھوڑ دی اور گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ جانے والی چھوٹی سی ندی کے کنارے کنارے بنگو پارک کی طرف چل پڑے۔ وہاں سے ہم ریالٹو سینما کی طرف آ گئے اور یہاں سے کرسٹل ہوٹل پہنچ کر اس کے کیبن میں بیٹھ گئے۔

"برقعہ بے شک اتار لو۔"

"مگر مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے"

"گھبراتی کیوں ہو بابا۔ کہہ دینا ایک سہیلی کے گھر کتابیں نوٹ کرنے چلی گئی تھی۔"

ثریا نے برقعہ اتار کر کرسی کے ساتھ لٹکا دیا اور میں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ کرسٹل کے کیبن بڑے خوبصورت ہوا کرتے تھے۔ چاروں طرف شیشے، ان پر نیلے نیلے ریشمی پردے، شیشہ لگی بڑی میز اور گدے دار کرسیاں۔ وہاں کبھی کسی نے کسی پر شک نہیں کیا تھا۔ شاید وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ بہت کم لوگ دوسروں کے معاملے میں دخل دیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جبکہ ثریا ہمارے شریف پورے والے گھر قوالی پر آئی تھی تو میں اسے لے کر رات کے دس گیارہ بجے تک کمپنی باغ کے ایک پلاٹ میں بیٹھا رہا تھا اور کسی نے ہمارے پاس آ کر یہ نہ پوچھا تھا کہ آپ لوگ کون ہیں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے دلوں میں چور نہیں تھا۔ ہم دو معصوم بچوں کی طرح وہاں بیٹھے رہے تھے۔ اب وہ معصومیت ہم

سے چھن گئی ہے۔ اب بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں۔ شاید اسی لئے اب ہر جگہ پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

ثریا نے اس روز سفید قمیض پر نیلی کوٹی اور نیلا ہی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے بالوں میں نیلے رنگ کے ربن بندھے تھے اور ہونٹوں کے پاس گال پر نیلی سیاہی کا ذرا سا نشان تھا۔ اتنے میں وہاں چائے آ گئی۔ میں نے ثریا کے پیالے میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا شہر تمہیں پسند آیا؟"

"ہوں"

"ہوں کیا؟"

"بہت پسند آیا۔"

"اب اسے چھوڑ تو نہیں دو گی؟"

"پڑھائی ختم کرنے کے بعد تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔

"اس کے لیے ابھی دو سال کا عرصہ پڑا ہے۔"

ثریا نے قدرے اداس لہجے میں کہا:

"دو سال بیتتے کون سی دیر لگتی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ہم ان دو سالوں سے دو صدیوں کا منافع حاصل کریں گے۔ ہم اس کوزے میں دریا بند کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم اتنی دھومیں مچائیں گے کہ جب جدا ہونے لگیں تو ہمیں یہ افسوس نہ رہے کہ ہم نے ان چند لمحوں کا فائدہ نہیں اٹھایا۔"

ثریا چائے پینے لگی۔

"یہ کیسے ہو سکے گا۔ میں گھر سے زیادہ باہر نہیں نکل سکتی۔ یہی سکول تک ہی آ جا سکتی ہوں۔ اور یہاں بھی ہمارا روز ملنا مناسب نہیں ہوگا۔ کسی کو پتہ چل گیا تو اتنی ملاقات کر لینے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔"

میں نے سگریٹ جلا کر ماچس کی سلائی پھینکتے ہوئے کہا:

"تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہ کیا کرو۔ اب تم یہاں آ گئی ہو تو یہ ناممکن ہے کہ میں تم سے ملاقات نہ کروں۔ زیادہ سے زیادہ اور وہ بھی تمہاری خاطر صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ دوسرے روز تمہارے سکول آ جایا کروں۔ مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم سے ملنا ترک کر دوں یا

ہفتہ ہفتہ بھر کا وقفہ ڈالوں۔"

ثریا نے بڑی گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"آخر آپ کو ان ملاقاتوں سے کیا مل جاتا ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لگایا اور ثریا کی طرف جھک کر بولا:

"وہی جو سورج مکھی پھول کو سورج کی طرف منہ کر لینے سے ملتا ہے۔"

"اسے تو قدرت نے یہی سکھایا ہے۔ وہ تو مجبور ہے۔"

"مجھے بھی قدرت نے یہی سکھایا ہے ثریا میں بھی مجبور ہوں۔"

ثریا نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"تو پھر آپ چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا:

"میں سورج کے ساتھ غروب بھی ہو جاتا ہوں۔ بلکہ اس کے غروب ہونے سے پہلے میرا رنگ اڑتا ہے، میری پتیاں مرجھا جاتی ہیں۔ تم نے کبھی سورج مکھی کو شام کے وقت نہیں دیکھا؟ مگر تم بٹالے میں رہ کر سورج مکھی پھول کہاں دیکھ سکتی ہو۔ وہاں تو سوائے مکھیوں کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

ثریا چمک کر بولی:

"جناب ہمارے بٹالے کی بد تعریفی نہ کریں۔ آخر میں بھی تو آپ کو۔۔۔۔۔"

اتنا کہتے کہتے ثریا شرما گئی اور اس نے سر جھکا لیا اور ماچس کی سلائی نکال کر اسے توڑنے مروڑنے لگی۔

میں نے مسکرا کر کہا:

"اب رک کیوں گئیں۔ بولو نا۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ بٹالے میں سوائے تمہارے اور کیا رکھا ہے۔ سو تم بھی وہاں سے آ گئی ہو۔ کوئی حسین چیز اس قصبے کی گندگی میں نہیں رہ سکتی۔ وہاں رہنا ہے تو یا چاول کا دھندا کرو، لوہا کوٹو، مکھیاں مارو اور یا بھاگ کر یہاں چلے آؤ۔"

"مگر وہاں سبزیاں اور دودھ تو بالکل خالص ہوتا ہے۔"

"میں عاشق ہوں ثریا، ویشنو بھگت نہیں ہوں۔ مریض عشق ہوں، مریض تپدق نہیں

ہوں۔ مجھے زندہ اور زندگی سے بھرپور چیزوں سے پیار ہے۔ جیسا یہ کمپنی باغ، جیسا کہ تم
ارے لے دے کر وہاں ایک خربوزے کی بھرپور فصل ہوتی ہے۔ اور وہ بھی وہاں کے بڑ
نکلتے ہیں۔"

"اچھا اس بار میں آپ کو بڑے میٹھے خربوزے کھلاؤں گی۔"

"کیا تمہارا اپنا کھیت ہے؟"

"نہ بھی ہو تو کیا ہے۔ کم از کم آپ کی طرح اناڑی نہیں ہوں۔ اچھی بُری چیز
پہچان رکھتی ہوں۔"

"یہ نہ کہو۔ اگر مجھے اچھے بُرے کی تمیز نہ ہوتی تو تم سے کبھی محبت نہ کرتا۔"

"اچھا ---- تو کیا آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ بیرا فوراً اندر آ کر بولا۔

"مجھ سے کچھ کہا صاحب؟"

"نہیں بھئی"

میں نے ثریا کا ہاتھ میز کے نیچے سے تھام لیا۔

"محبت سے بھی بڑھ کر میں تمہاری پوجا کرتا ہوں ثریا۔ محبت تو اس راستے کا سنگ
میل ہے۔ اس کی منزل بہت آگے ہے۔ اس سنگ میل کو تو میں بہت پیچھے چھوڑ
ہوں۔"

ثریا نے برقعہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اب چلنا چاہیئے۔"

میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"میں ابھی نہیں جانے دوں گا۔"

ثریا نے سر ڈھلکا کر کہا۔

"ہائے خالد دیر ہو رہی ہے۔"

اس کے لہجے نے میرا ہاتھ موم کر دیا۔ میرا دل موم کر دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ
دیا۔ اس نے برقع پہنا۔ میں نے بل ادا کیا اور ہم کرسٹل ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ میں
چھوڑنے ہال بازار تک اس کے ساتھ ساتھ گیا۔ راستے میں ہم دنیا جہان کی باتیں

رہے۔ ہال بازار کے دروازے میں پہنچ کر میں اس سے الگ ہو گیا۔

"تمہیں گھر کا راستہ معلوم ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

میں دروازے کی دیوار کے پاس کھڑا ثریا کو بازار میں جاتے دیکھتا رہا اس کا نسواری
برقعہ ہوا میں ہلکے ہلکے لہرا رہا تھا۔ ذرا دور جا کر وہ مسجد خیرالدین کا موڑ گھوم گئی۔ موڑ مڑنے
سے پہلے اس نے پلٹ کر ایک پل کے لئے مجھے دیکھ لیا۔

خوش بہار کا موسم تھا کہ بڑے بھائی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔

اس خوشی میں انہوں نے قوالی کی محفل کا اہتمام کیا۔ اس تقریب پر مسعودہ بھی جو کراچی جا چکی تھی امرتسر آئی۔ ظاہر ہے ثریا کا آنا لازمی تھا۔ قوالی کا اہتمام گلی میں کیا گیا۔ قناتیں لگا کر زمین پر دریاں اور چاندنی بچھا دی گئی۔

قوال بڑے مشہور تھے۔ گھر میں رونق لگ رہی تھی۔ تقریباً سبھی رشتے دار جمع تھے۔ بٹالے سے مسعودہ کے سسرال والے اور ثریا کی والدہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ پلاؤ کی دو بڑی دیگیں اور ایک دیگ شوربے کی دم کردی گئی۔ سبز چائے کا بڑا دیگچہ چولہے پر چڑھ گیا۔ ایک بوڑھی نانی جان کو سبز چائے کا مختار بنادیا گیا۔ انہوں نے خوب حساب لگا کر پانی کے ڈونگے دیگچے میں ڈال دیئے۔ جونہی انہیں خبر ملتی کہ کوئی نیا مہمان آگیا ہے وہ جلدی سے پانی کا ایک ڈونگا اور چائے میں انڈیل دیتیں۔

قوالی رات کے پورے دس بجے شروع ہوئی تھی۔ رات کا کھانا کھا کر میں، مسعودہ، مریم، میری بڑی بھابی اور ثریا کمپنی باغ کی سیر کو چل دیئے۔ باغ میں رات کو خنکی بڑھ جانے کی وجہ سے اتنے لوگ نہیں تھے۔ صرف ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والے پلاٹ میں عورتیں بچے اور کچھ لوگ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ ہم کافی دیر تک باغ میں سیر کرتے پھرے۔ آخر ہم گنبد والے پلاٹ کے عقبی قطعے میں بنچوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس قطعے کی گھاس ترشی ہوئی تھی۔ کنارے کنارے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گنبد کی بائیں جانب جامن کے جھنڈ تھے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ پلاٹ میں بجلی کی خوب روشنی تھی۔

دائیں جانب اسم کے جھکے جھکے درختوں کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہ وہی شریف پورے والی نہر تھی۔ اس نہر پر ایک چھوٹی سی پکی پلیا تھی۔ جس کی پرلی طرف ناشپاتیوں کا ایک وسیع باغ تھا۔ اس باغ میں ناشپاتی کے درختوں پر ہری بھری ناشپاتیاں اندھیرے میں بالکل دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ مگر ان کی کچی کچی خوشبو یہاں تک آرہی تھی۔

یہاں سے اٹھ کر سب لوگ نہر کی طرف چل دیئے۔ نہر کا پانی بڑی سست رفتار خاموشی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا اور اسم کے درختوں نے اس اندھیرے کو زیادہ گھرا بنادیا تھا۔

میں جان بوجھ کے ثریا کے ساتھ ہولیا اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ثریا نے پہلے تو ہاتھ چھڑانے کو کوشش کی پھر اپنے آپ ہی کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔ نہر کے دوسرے کنارے پر ناشپاتیوں کا گھنا باغ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس باغ میں کوئی رکھوالا نہیں تھا۔ دراصل یہ دیسی ناشپاتیاں تھیں جو ایک آنے کی سیر بکتی تھیں۔ مگر چوری کی چیز میں بڑی لذت ہوتی ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر ان عورتوں نے نہر کی پلیا عبور کر کے اس باغ پر دھاوا بول دیا۔ باغ کے درختوں میں سے کچھ پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ اندھیرا اس قدر گھرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن عورتوں کو ناشپاتیاں بالکل صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کیڑے پتنگوں نے ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی تک جو باریک ریشمی تاروں کے جال بن رکھے تھے وہ ٹوٹ گئے اور ناک منہ سے الجھنے لگے۔ پاس ہی کہیں ایک کتا ذرا سا بھونکا اور پھر خاموش ہو گیا۔ عورتوں نے سخت ناشپاتیاں توڑ توڑ کر جھولیاں بھرنا شروع کر دیں۔

میں ثریا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا زبردستی باغ کے ایک ویران گوشے میں لے گیا۔

"خدا کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔"

"بھئی ہم ناشپاتیاں توڑنے آئے ہیں۔"

"نہیں نہیں مجھے ڈر لگتا ہے۔ چلو ان کے پاس چلیں۔"

میں نے جلدی سے دو تین ناشپاتیاں توڑ کر انہیں ثریا کی جھولی میں ڈال دیا۔

"یہ رشوت لے لو بابا اور تھوڑی دیر رک جاؤ۔"

ثریا ہنس پڑی۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ جب عورت ہنس پڑے تو وہ بڑی مہربان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ثریا کا دل بھی خوش ہو کر مجھ پر مہربان ہو گیا۔ ہمارے سروں پر ناخ کے درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور ایک ٹہنی تو میری گردن میں چبھ رہی تھی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے دوسری ٹہنی میں ٹانک دیا۔

وہاں اندھیرا اتنا گھرا تھا۔ کہ ہمیں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کے لئے ایک دوسرے کو ٹٹولنا پڑتا تھا۔ پتنگے سے اڑاڑ کر ہماری آنکھوں میں پڑ رہے تھے۔ لیکن ہمیں کسی کا ہوش نہ تھا۔ ہم محبت کی سرگوشیوں میں کھوئے دنیا جہان کی باتوں سے بے خبر ناخ کے درختوں تلے کھڑے ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔ ثریا کے کپڑوں سے حنا کے عطر

کی تیز مہک اٹھ رہی تھی۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں دلہن سے لپٹا ہوا ہوں۔

حنا کے عطر کے ساتھ میری یادیں کچھ اسی قسم کی ہیں۔ ثریا کی کوٹی مخمل کی تھی۔ جس پر میری انگلیاں پھسل رہی تھیں۔ میں نے ثریا کے شاندار بالوں والے سر کے ساتھ اپنا گال لگا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ناخ کی گنجان ٹہنیوں میں سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آ رہے تھے۔ باغ میں گیلی مٹی اور جلے ہوئے پتوں کی بو سی اٹھ رہی تھی۔ ایک چیونٹی نے مجھے گردن پر کاٹ کھایا۔ میں نے اسے وہیں مسل دیا۔

کم بخت ہمارے رنگ میں بھنگ ڈالنے کہاں سے آ گئی تھی!

اس وقت تو ایسی چیزوں کی ضرورت تھی جو ہماری بھنگ میں تھوڑا سا رنگ ڈالتیں۔ اچانک ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ ثریا نے چونک کر سر اٹھا لیا۔ میں نے کان کھڑے کر لئے۔ وہی آہٹ ایک بار پھر ہوئی میں مطمئن ہو گیا۔ ثریا پریشان ہو گئی۔

"گھبرانے کی بات نہیں درخت کی ٹہنیوں پر سے پتا ٹوٹ کر گرا ہے۔"

"نہیں کچھ اور تھا۔"

"ارے بھئی پتوں کے ٹوٹنے کی آواز تم سے بہتر پہچانتا ہوں۔ تم صرف اس بات خیال رکھو کہ کسی کا دل نہ ٹوٹنے پائے۔"

اور ایک بار پھر باغ کے اس پراسرار اندھیرے میں میرے ہونٹوں نے ثریا ہونٹ تلاش کر لئے۔ مجھے یوں لگا جیسے ناخ کی شاخوں پر ایک بار پھر سفید سفید شگوفے پھو آئے ہیں۔ اور تیز گرم ہوا میں ان کی پتیاں ایک ایک کر کے زمین پر بکھرنے لگی ہیں درختوں کے عقب سے ندی کے بہنے کی ہلکی ہلکی سسکار نما آواز آ رہی تھی اور ایسی گھاس کی جو نہر کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میری کمر میں درخت کا کھردرا تنا چبھ رہا تھا۔

"ثریا!"

"جی۔"

ثریا کی خشک سی آواز کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

ثریا نے اپنا سر میرے سینے میں لگا دیا اور میری قمیص کو اپنی مٹھی میں زور سے لیا۔ اس بچے کی طرح جو ماں کی آغوش سے جدا نہ ہونا چاہتا ہو۔

"بولو ثریا۔۔۔۔ مجھ سے شادی کرو گی نا؟"

ثریا نے ایک گہرا سانس لیا اور کچھ نہ بولی۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا لیا۔

"میری بات کا جواب دو ثریا! کیا دلہن بن کر میرے گھر آؤ گی؟"

"یہ کیسے ہو گا؟"

ثریا نے غمگین آواز میں اتنا کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کی بند آنکھوں پر رکھ دیئے۔ ثریا کی بند آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تھے۔

"رو رہی ہو ثریا؟"

ثریا نے نفی میں سر ہلایا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اسے ساتھ لگا لیا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"روؤ نہیں ثریا! تم نے جس آرزو کا خواب دیکھا ہے میں نے اس کی تعبیر دیکھی ہے۔ میں تمہیں کبھی اکیلی نہیں چھوڑوں گا۔ تم ایک دن ضرور دلہن بن کر میرے گھر آؤ گی۔ ناشپاتی کے یہ پیڑ اور ان کی ٹہنیوں میں سے جھانکتے ہوئے پھولوں ایسے ستارے میرے آج کے اس پیمان کے گواہ رہیں گے۔ میں تمہارا دل اپنے دل پر رکھ کر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔"

ثریا سسکیاں بھرتی رہی۔

"اگر ایسا نہ ہوا۔۔۔۔ ایسا نہ ہوا تو خالد میں مر جاؤں گی۔"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔ ثریا! محبت کر رہا ہوں۔ خالص جسم اور خون کی محبت۔ میرا جسم تمہاری طرف لپکتا ہے۔ میرا خون دل کی طرف نہیں تمہاری طرف دوڑتا ہے۔ میں اسے نہیں روک سکتا۔ مجھے تمہیں حاصل کرنا ہی ہو گا۔ لو اب آنسو پونچھ ڈالو اور چلو واپس چلیں۔ وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔

ثریا نے میرے سینے پر سے سر اٹھا کر آنسو پونچھے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باغ سے باہر نکل آئی۔ ہم دونوں نہر کی پٹڑی پر آ گئے۔ میں نے احتیاطاً باغ میں سے کتنی ہی ناشپاتیاں توڑ کر اپنی جھولی میں بھر لیں۔ عورتوں کی منڈلی ہمیں نہر کی پٹڑی پر ہی مل گئی۔ وہ لوگ ناشپاتیوں کے جھولے بھرے افراتفری کے عالم میں چلے

آ رہے تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ کھیل کے اس ہنگامے میں کسی نے بھی ہم سے نہ
پوچھا کہ ہم اتنی دیر باغ میں اکیلے کہاں رہے۔

گھر پہنچ کر ہم نے ناشپاتیاں یونہی دالان میں ڈھیر کر دیں۔ اس وقت گلی میں لوگ
قوالی سننے لئے جمع ہو گئے تھے۔ اور قوال تخت پر بیٹھے طبلہ اور ہارمونیم کے سُر ٹھیک کر
رہے تھے۔ قوالی رات کے دو بجے تک جاری رہی۔ اس اثنا میں اکثر عورتیں سو گئیں۔ ثریا
بھی سو گئی تھی۔ میں ایک بجے رات تک اپنے دوستوں کے ساتھ گلی میں قوالی سنتا رہا اور پھر
میں بھی آ کر سو گیا۔

دوسرے روز مسعودہ بٹالے چلی گئی۔ ثریا اپنی خالہ کے ساتھ چچا کے ہاں فرید چوک چلی
گئی۔ اور گھر میں پھر وہی پرانے والا نقشہ باقی رہ گیا۔ موسم سرما پوری طرح شروع ہو چکا تھا۔
رات کو اچھی خاصی سردی پڑتی اور صبح کو گلیوں بازاروں میں دھند چھائی رہتی۔ لڑکیاں گرم
کپڑوں میں لپٹی لپٹائی ٹھٹھرتی ہوئی اسکولوں کو روانہ ہوتیں۔ دن کو بڑی سنہری اور نیم گرم
دھوپ چمکتی۔ لوگ دھوپ میں بیٹھ کر گنے چوستے، باغوں میں سیریں کرتے۔

ثریا سے ہر تیسرے چوتھے روز ملتا۔ اب اسکول کے باہر کھڑے رہنے کی بجائے میں
ہال بازار میں ہی اس کے ساتھ ہو لیتا۔ اس طرح کسی کو شک نہ گزرتا۔ اسکول والے یہ سمجھتے کہ
میں اسے اسکول چھوڑنے آتا ہوں۔ واپسی پر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی جاتی۔ جس روز مجھے
چھٹی کے بعد اس سے ملاقات کرنی ہوتی تو وہ چھٹی سے کچھ وقت پہلے ہی اسکول سے باہر نکل
آتی۔

اس دوران میں ہم نے شادی بیاہ کے پکے عہد و پیمان کر لئے تھے۔ جاڑے کی رت
آخری دموں پر تھی۔ پیڑ پودوں کے پتے خزاں کی تیز ہواؤں میں جھڑنا شروع ہو گئے تھے۔
ناشپاتی کے درختوں کی ٹہنیاں اپنے پتے جھاڑ کر ننگی ہو کر سیاہ پڑ گئی تھیں۔ کمپنی باغ والی
نہر خشک ہو گئی تھی اور اس میں اجڑے ہوئے باغوں کے کچے امرودوں کی ڈھیریاں پڑی
رہتی تھیں۔ گیندے کے بسنتی پھولوں کے ساتھ ساتھ سویٹ پنیر کے پھول بھی کھلنا
شروع ہو گئے تھے۔ مجھے ثریا سے ملے کوئی تین ایک دن ہو چکے تھے کہ اچانک سعید نے آ کر
مجھے ثریا کا ایک خط دیا۔ یہ خط امرتسر سے ہی لکھ کر ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔ اس میں صرف اتنا لکھا
تھا کہ خط ملتے ہی مجھ سے ملو۔ میں فکر مند سا ہو گیا۔ ثریا کو مجھے اس طرح بلانے کی کیا ضرورت

پڑ گئی؟

خط مجھے شام کو ملا۔ اس وقت میں نے ان کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ میں بڑی بے
تابی سے صبح کا انتظار کرنے لگا خدا خدا کر کے سردیوں کی لمبی رات ختم ہوئی۔ دن نکلا۔ میں
جلدی سے تیار ہو کر ہال دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

روز کے وقت پر مجھے ثریا دور سے آتی دکھائی دی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر اس
کے قریب ہو گیا۔ تھوڑی دور تک ہم بالکل خاموش چلتے گئے۔ میں بات کرتے ہوئے گھبرا رہا
تھا۔ خدا جانے مجھے جواب میں کیا سننا پڑے۔ ادھر ثریا مجھے کچھ بتاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔
آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"خیریت تو ہے نا۔"

ثریا نے ایک گہرا سانس لیا اور خاموشی سے چلتی گئی۔

"آخر کچھ تو بتاؤ۔ کیا۔۔۔۔۔"

"ان لوگوں نے میری منگنی کر دی ہے۔"

پہلے تو مجھے کچھ سنائی نہ دیا کہ ثریا کیا کہہ رہی ہے۔ جب میرے پھر پوچھنے پر ثریا نے
وہی جملہ دہرایا تو میں سکتے میں آ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"لیکن ہو گیا ہے۔"

ثریا کی آواز شکستہ سی تھی۔ وہ گردن جھکائے چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ بازار میں
تانگے سائیکل آ جا رہے تھے۔ ہم ریلوے پل عبور کر کے ہسپتال کی طرف آ گئے۔

"لیکن یہ سب کچھ کب ہوا؟"

"جس روز تم مجھے چھوڑ کر گئے تو میں نے گھر جا کر دیکھا کہ امی آئی ہوئی ہیں۔ انہوں
نے کہا کہ مجھے ان کے ساتھ ایک روز کے لئے بٹالے چلنا ہو گا۔ میں نے سوچا کوئی کام ہو گا۔
وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے مجھے نئے کپڑے بدلنے کو کہا۔ شام کو کچھ عورتیں وہاں آ گئیں۔
ان کے ساتھ چند ایک بزرگ صورت مرد بھی تھے۔ مجھے تب پتا چلا کہ میری منگنی ہو رہی ہے۔
اب میں کیا کر سکتی تھی۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ نیچے مردوں میں منگنی کا اعلان ہو گیا
تھا۔ وہ لوگ سونے کی انگوٹھی اور جوڑا کپڑوں کا دینے کے بعد منگنی کا دودھ پی چکے تھے۔

دونوں بھائی ان کی خاطر مدارات کو لگے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی نے اوپر آکر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔"
"تم میری بہن ہی نہیں بیٹی بھی ہو۔ اگر اباجان زندہ ہوتے تو سیری جگہ آج تمہارے سر پر ان کا ہاتھ ہوتا۔"
"میں ساکت سی ہو کر رہ گئی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سر پتھر بن گیا تھا۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ دوسرے دن گھر میں ڈھولک وغیرہ بجتی رہی۔ مجھے مہندی لگائی گئی۔ سہیلیوں نے چھیڑ خانی کی اور تیسرے روز میں بھائی کے ساتھ یہاں آگئی۔ میں نے آتے ہی تمہیں خط لکھ دیا۔ خالد! اب کیا ہوگا؟"
"تم ابھی سکول جاؤ۔ چھٹی کے وقت میں یہاں موجود ہوں گا۔ اس وقت تم سے بات کروں گا۔ ابھی میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ ابھی تو مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔"

میں نے ثریا کو سکول کے گیٹ میں داخل کیا اور خود بوجھل قدم اٹھاتا، طرح طرح کے خیالات میں کھویا سیدھا کرسٹل ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا رہا بمشکل ایک کپ چائے پی۔ کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر کمپنی باغ میں یونہی چکر لگانے لگا۔ وہ پلاٹ دیکھا جہاں اس روز ثریا کے ساتھ میں نے باغ میں گھس کر ناشپاتیاں توڑی تھیں۔

وہ باغ دیکھا جس کی گھنی تاریکی میں کسی درخت کے ساتھ لگ کر ہم نے چاند ستاروں اور درختوں کی ٹہنیوں کو گواہ بنا کر کبھی نہ بچھڑنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ نہر دیکھی جس کی پٹڑی پٹڑی ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہاں سے گزرے تھے۔ ذہن عجیب عجیب قسم کے خوفناک خیالات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کیا ثریا واقعی دلہن بن کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے چلی جائے گی؟ کیا اسے کوئی دوسرا آدمی بیاہ کر لے جائے گا؟" کیا وہ اسی طرح کسی دوسرے مرد کے سینے پر سر رکھے گی جس طرح وہ میرے سینے پر رکھا کرتی تھی؟ کیا اب کوئی اور آدمی اس کے خوبصورت سیاہ بالوں پر اپنے ہاتھ پھیرا کرے گا؟
کیا ان خوبصورت ہونٹوں-----؟
میں کانپ گیا۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ محبت کا پہاڑ کاٹ

جس نہر کو یہاں تک لایا ہوں وہ کسی دوسرے کے کھیتوں کو سیراب نہیں کر سکتی۔

لیکن خالد اب کیا ہو سکتا ہے۔ تقدیر نے اپنا وار کر دیا ہے۔ اب تم سوائے اس کے اور کیا کر سکتے ہو کہ اسے بھگا کر لے جاؤ۔ مگر اسے بھگا کر کہاں لے جاؤ گے؟ اس میں صرف تمہارے خاندان ہی کی نہیں بلکہ ثریا کی اس ماں اور محبت کرنے والے بھائیوں کی عزت کا سوال ہے جنہوں نے تمہاری اتنی خاطریں کی تھیں۔ جو کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ تم ان کی بہن کو اغوا بھی کر سکتے ہو۔ اور پھر اس حالت میں جبکہ انہوں نے اس کی منگنی بھی کر دی ہے۔

تو کیا ثریا اب مجھ سے بچھڑ جائے گی۔ (اس بچھڑ جانے کا شاید مجھے اتنا غم نہ ہوتا جتنا اس بات کا صدمہ تھا کہ وہ ایک روز میرے سامنے سے اپنے خاوند کے ساتھ گزرے گی۔ میں یہ کس طرح گوارا کروں گا۔ میں اس ہلاکت خیز منظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ اگر ثریا کو کسی دوسرے کی آغوش کی زینت بننا تھا تو اس نے میرے لئے اپنی آغوش وا کیوں کی تھی؟ اگر کسی دوسرے ہی کا گھر بسانا تھا تو پھر مجھ پر اپنے گھر کا دروازہ کیوں کھولا تھا؟ اگر شادی کسی غیر سے کرنی تھی تو مجھ سے محبت کی قسمیں کیوں کھائی تھیں۔ مجھ سے عہد و پیمان کس لیے کئے تھے؟)

دوپہر کے وقت میں ثریا کے سکول کے گیٹ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ میرے قریب ہی دوسری لڑکیوں کے لئے آئے ہوئے تانگے اور موٹریں وغیرہ کھڑی ہوتی گئیں۔ چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ ثریا باہر نکلی۔ میں اسے لے کر کمپنی باغ میں آگیا۔ مجھے اس روز سارا باغ ویران نظر آرہا تھا۔ پت جھڑ ہونے کی وجہ سے ویسے بھی باغ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں پر سے سوکھے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ہوائیں انہیں اڑائے لئے پھر رہی تھیں۔

ہم ایک جگہ انار کے درختوں کے درمیان خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ یہاں ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا ثریا نے نقاب الٹ لیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں غم کے سائے اترے ہوئے تھے۔
"اب کیا ہوگا خالد؟"
میں نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا:۔

"شادی"

ثریا تڑپ اٹھی۔ اس نے گہری سوگوار آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ایسا تو نہ کریں۔ میں تو کئی راتوں سے سو نہیں سکی۔"

"گھبراؤ نہیں شادی کے بعد بڑی گہری نیند آئے گی۔"

"خدا کے لئے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔"

"سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔ شادی کے بعد خود بخود سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر نیند بھی آجائے گی۔ چہرے پر سرخی بھی آجائے گی۔ کلائیوں میں سونے کے کنگن اور پاؤں میں سلمہ جڑی زرکار جوتی پہن کر جب تم مہارانیوں کی طرح نئے گھر میں داخل ہو گی تو پرانے دنوں کا خیال گرد بن کر اڑ جائے گا۔ محل کے سب سے اونچے جھروکے میں بیٹھ کر جب تم جھونپڑوں پر نظریں ڈالو گی تو تمہیں وہ سب کچھ ہیچ محسوس ہو گا اور تمہاری شان کے منافی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! یہ الزام آپ شادی کے بعد دے سکتے ہیں۔ مگر میں شادی کہاں کر رہی ہوں؟"

"جس نے منگنی کروالی ہے وہ شادی بھی کروالے گی۔ ایک بھائی نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھا اور تم پتھر بن گئیں۔ جب شادی کے روز دونوں بھائی اپنی ٹوپیاں تمہارے پاؤں میں ڈال دیں گے تو تمہاری زبان سے بے اختیار "ہاں" نکل جائے گا۔ ثریا! (خاندان کی عزت، بھائی بہنوں کے عزت کا خیال محبت سے کہیں زیادہ اہم اور بلند ہوتا ہے۔ ان چیزوں سے لگاؤ رکھنے والے محبت نہیں کر سکتے اور جو محبت کرتے ہیں پھر ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا کرتے۔)

"مگر خدا کے لئے میری بات تو سنیں۔"

"میں تمہاری شادی کی شہنائیاں سن رہا ہوں ثریا۔ مجھ سے تمہاری باتیں کہاں سنی جائیں گی۔ مجھے ڈالی پر کھلا ہوا پھول نہ دکھلاؤ ثریا! میں پتوں میں چھپا ہوا سانپ دیکھ رہا ہوں۔ اگر ڈوبتے ہوئے کو بچا نہیں سکتی ہو تو کنارے پر کھڑے ہو کر اس کی بے بسی کا تماشہ بھی نہ کرو۔"

"لیکن میں کہاں کنارے پر کھڑی ہوں میں بھی تو آپ ہی کے ساتھ ڈوب رہی ہوں۔"

"ساتھ کوئی نہیں ڈوبا کرتا ثریا۔۔۔۔ اور پھر جنہیں تیرنا نہیں آتا وہ بہت کم ڈوبا کرتے ہیں۔ اگر تمہیں یہاں شادی نہ کرنی ہوتی تو تم منگنی ہی نہ ہونے دیتیں۔ اب جبکہ تم نے پودے کا بیج خود زمین میں بو دیا ہے تو تم اس کے پتوں کو باہر نکلنے سے کبھی نہیں روک سکتیں۔ اب تم انکار کرو گی تو گھر والے کہیں گے ایسی بات تھی تو ہمیں پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ کم از کم ہم دوسروں کے سامنے ذلیل تو نہ ہوتے۔ گھر کے بزرگ لوگوں کا کسی کو وچن دے دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر جب بیٹی کی شادی کا مسئلہ ہو۔ اب اگر انہوں نے منگنی توڑ دی تو سارے شہر میں وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ یاد رکھو وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ وہ تمہارا گلہ گھونٹ دیں گے مگر منگنی نہیں توڑیں گے۔ ولایت والوں کی پتلونیں یہاں ضرور آگئی ہیں مگر ان کا ضمیر ابھی تک یہاں نہیں آیا۔"

میں نے سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا اور دونوں ہاتھوں میں سر دے کر خاموشی سے انار کے پیڑوں میں کھلی ہوئی انار کی گلابی کلیوں کو تکنے لگا۔ ثریا نے بھی سر جھکا لیا تھا (وہ بے حد اداس ہو رہی تھی۔ اس کی اداسی اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ وہ شادی کے لئے رضامند ہو گئی ہے اور اب اس بات پر افسوس کر رہی ہے کہ اس نے مجھ سے عہد و پیمان کیوں کئے۔ اس خیال نے مجھے بے حد اذیت دی۔ میرا حلق کڑوا ہو گیا اور گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ ہونٹ خشک ہو کر جلنا شروع ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے سردی کے باوجود سینک سا اٹھنے لگا تھا۔ مجھے اس طرح سے اپنی بڑی توہین محسوس ہو رہی تھی کہ ثریا صرف محبت کے وعدوں کی بندھی بندھائی میرے پاس بیٹھی مجھ سے اظہار ہمدردی کر رہی ہے۔ میں اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا سکتا ہوں مگر یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھ سے آکر یہ کہے کہ اسے میرے مکان کے جلنے کا بڑا افسوس ہے۔)

"لیکن آپ میری بات بھی تو سنیں۔ میں نے یہ کب کہا کہ میں نے منگنی کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر میری باتوں سے کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے شادی بھی کرلی ہے؟ یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔ کہ میں انکار نہ کرسکوں گی۔ یہ آپ کا میرے بارے میں خیال ہے نا۔ میں کیا کروں گی اسے آپ نہیں جانتے۔"

میں نے ثریا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"تم شادی کرلوگی۔ مجھ سے نہیں اس شخص سے جس کے ساتھ تمہاری منگنی طے ہوئی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ تمہاری طرح کی گھریلو لڑکیاں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرسکتیں اور تم لوگوں کو کرنا بھی یہی چاہیئے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تمہیں محبت کے پیمان باندھنے کا کوئی حق نہیں۔ تمہیں تو شادی کے بعد اپنے خاوند سے محبت کرنی چاہیئے۔

ثریا نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ کی یہی مرضی ہے؟"

"اس لئے کہ تمہاری مرضی بھی یہی ہے۔ تم اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے مجھے اور اپنے آپ کو تسلیاں دے رہی ہو۔"

"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں دوسری قسم کی لڑکی ہوں۔"

"میں تم سب قسم کی لڑکیوں سے واقف ہوں۔ تمہاری لڑکیوں کی ایک قسم وہ ہے جو پہلی ہی نظر میں کار اور چیک بک پر عاشق ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم ان لڑکیوں کی ہے جو شادی سے پہلے فلرٹ کرتی ہیں محبت نہیں اور شادی کے بعد یہ سلسلہ یک قلم موقوف کر دیتی ہیں۔ تیسری قسم ان لڑکیوں کی ہے جو شادی سے پہلے بڑی پاکباز اور عفت، آب رہتی ہیں جب بیاہ ہو جاتا ہے تو دل کھول کر غیر مردوں سے عشق لڑاتی ہیں۔ چوتھی قسم کی وہ لڑکیاں ہیں جو کبھی عشق وغیرہ کے جھنجٹ میں نہیں پڑتیں۔ بس پڑھتی ہیں سلائی کا کام سیکھتی ہیں۔ شادی کرتی ہیں بچے پیدا کرتی ہیں۔ ان کی دیکھ بھال اور خاوند کی محبت کے لیے زندگی وقف کردیتی ہیں۔ سب سے آخری قسم ان لڑکیوں کی ہے جو آدھی آدھی رات اپنے محبوب کو گھر بلواتی ہیں۔ ان سے دیواریں پھندواتی ہیں۔ بھرپور محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ لپٹ جاتی ہیں۔ شادی کے گرم جوش وعدے کرتی ہیں اور جب ماں باپ کسی اور کے ساتھ دامن باندھ دیتے ہیں تو رو رو کر بُرا حال کرلیتی ہیں۔ مگر کسی سے کچھ نہیں کہتیں۔ اپنے محبوب کے آگے آنسو بہا بہا کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرتی ہیں۔ اور دل میں

زندگی کی امنگیں لئے چپکے سے ڈولی میں سوار ہو کر اپنے خاوند کے گھر کو روانہ ہو جاتی ہیں۔ یوں وہ محبوب کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں اور خاوند کو بھی نہیں گنواتیں۔ یہ سب سے خطرناک قسم ہے۔ یہ لڑکیاں نام نہاد رومان پسند ہوتی ہیں۔ یہ چاہتی ہیں کہ خاوند کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے دلوں میں کسی پرانی محبت کی کسک بھی ضرور رہے۔ یہ چاہتی ہیں کہ اپنے خاوند کے ساتھ ہنسی خوشی باغ کی سیر کرتے ہوئے کبھی کبھی کسی کو یاد کرکے اداس ہو جایا کریں۔ میرا خیال ہے تم اس قسم کی لڑکیوں میں سے ہو۔"

ثریا نے گردن اٹھا کر دل شکستگی کے عالم میں مجھے دیکھا۔

"میں پہلے ہی دکھی ہوں۔ آپ جلتی پر تیل تو نہ چھڑکیں۔ آخر میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ دشمنی نہیں کی۔ یہ زخم میرا ہے۔ اس کی گہرائی آپ کے زخم سے زیادہ عمیق ہے۔ میں اسے کس طرح بہلاتی ہوں۔ یا یہ مجھے کس طرح تڑپا تڑپا کر موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ یہ میں جانوں۔ آپ سے اس کو کیا۔"

اتنا کہہ کر اس نے نقاب الٹ دیا اور کتابیں اٹھا کر بولی:

"میں جارہی ہوں۔"

اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے اسے ناراض کیوں کر دیا ہو سکتا ہے وہ مجبور ہو۔ ہمارے ہاں لڑکیاں عورت کم اور مجبور زیادہ ہوتی ہیں۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا ہے۔ کچھ بھی ہو میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اس طرح اس کا دل نہیں دکھانا چاہیئے تھا۔

ثریا مجھ سے مزید بات کیے کمپنی باغ کے اس راستے پر چل پڑی جو آگے جا کر رام باغ والے ریلوے پھاٹک کو نکل گیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

کچھ دور تک ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی جب ہم وکٹوریہ ہسپتال کے پاس پہنچے تو میں نے کہا۔

"مجھے معاف کردو ثریا ----- میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا دل خون ہو گیا ہے۔ میرا ذہن پریشان ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ اگر اس جذباتی ہیجان سے مغلوب ہو کر میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس نے تمہیں دکھ پہنچایا ہو تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

ثریا نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس چپ چاپ چلتی گئی۔ عید گاہ کے پاس

پہنچ کر میں نے سگریٹ سلگایا اور بجھی ہوئی دیا سلائی پھینک کر کنکھیوں سے ثریا کی طرف دیکھا۔ نقاب کے پہلو سے اس کے گندمی رخساروں پر بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ پڑی ہوئی تھی اور کان کا ٹاپس صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہی رہو گی؟"

ثریا خاموش رہی۔

"کیا میری ہر بات کا جواب سوائے خاموشی کے کچھ اور نہیں ثریا؟"

ثریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"اچھا تو پھر خدا حافظ!"

اور اتنا کہہ کر میں جی ٹی روڈ پر مسلم ہائی سکول کی طرف مڑ گیا۔ شاید ثریا نے مجھے حیران ہو کر دیکھا ہو۔ لیکن میں نے پیچھے مڑ کر بالکل نہ دیکھا۔

میں سیدھا اپنے محلے شریف پورے میں آ گیا۔ یہاں آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک زبردست جلوس کی تیاری ہو رہی ہے۔ یہ جلوس ضلع کچہری کی عمارت پ لیگ کا جھنڈا لگانے جا رہا تھا۔ شہر میں اس قسم کے کئی جلوس ہر روز نکالے جا رہے تھے۔ مسلم لیگ کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کے بعد کانگریس، یونینسٹ اور اکالی پارٹی لیگ ک مخالف ہو گئی تھی اور لیگ کی طرف سے حصول پاکستان کی جدوجہد کو تیز کر دیا گیا تھا۔ ہر را شہر کی مسجدوں اور محلوں میں لیگ کے جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں ایک الگ مسلمان ریاست کا نظریہ ہی نہیں بلکہ نعرہ بھی دے دیا تھا۔ جس کی وجہ سے تقر امرتسر کا ہر مسلمان اپنے آپ ہی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آن کھڑا ہوا تھا۔ گلی گلی جلوس کی شکل میں "لے کے رہیں گے پاکستان۔" "خون کی ندیاں بہائیں گے پاکستا بنائیں گے۔" "پاکستان کا مطلب کیا۔ لاالٰہ الا اللہ" کے نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔

کانگریس کی ہائی کمان نے جب لیگ کی طرف سے پیش کیے گئے دو قوموں نظریے کی مخالفت کی تو مسلمانوں میں جوش و خروش بہت بڑھ گیا اور انہیں یقین ہو گیا ہندو ہر طریقے سے ان کے حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں۔ احرار اسلام پارٹی نے شروع شر میں بڑے دم خم دکھلائے۔ مگر لیگ کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور جوش کے سامنے وہ زیادہ نہ ٹھہر سکی۔ امرتسر کے ہندو اور سکھ پریشان ہو گئے۔ انہیں لگا جیسے امرتسر کے مسل

سارے ہندوستان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بھی پاکستان کے مطالبے کے خلاف اپنے اپنے محلے میں جلسے جلوس نکالنے شروع کر دیئے۔

مسلم لیگ کے جلسوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ ہر مسلمان کے ذہن میں یہی دھن سوار تھی کہ جس طرح بھی ہو گا پاکستان بنا کر ہی دم لیں گے۔ انہیں تو جیسے کسی جادو کی چھڑی نے چھو دیا تھا۔ قائداعظم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ صرف انہیں دیکھنے کے لئے سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر کے آتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہتے اس اُمید پر کہ شائد ان کی ایک جھلک ہی دکھائی دے جائے۔

یہ جنوری ۱۹۴۷ کے ہنگامہ خیز دن تھے۔

ہر طرف سیاسی اور مذہبی بیداری کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ لوگ گھنٹوں ایک دوسرے سے بحثیں کرتے۔ اور کئی بار نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی۔ ہر آدمی کی زبان پر پاکستان کا نعرہ تھا اور دل میں اسلام کی آگ روشن تھی۔ پاکستان کے نظریہ کے مخالفین صاف صاف مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خاموش ہو گئے تھے اور مسلم لیگ کے جلسوں وغیرہ میں بالکل حصہ نہیں لیتے تھے۔

تحریک کا جوش و خروش کالج اور سکول کی مسلمان لڑکیوں اور گھریلو عورتوں تک پہنچ گیا تھا۔ عورتوں کے جلوس الگ نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ حکومت نے شہر میں دفعہ 144 لگا رکھی تھی۔ مگر سیلاب کے سامنے تنکوں کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ ہر روز جلوس نکلتے، جلسے ہوتے، پولیس لاٹھی چارج کرتی آنسو لانے والی گیس کے بم چھوڑتی۔ تھوڑی دیر کے لئے بھگدڑ سی مچتی اور پھر وہی "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگنا شروع ہو جاتے۔

شام کو میں سعید کے گھر گیا۔ اسے جا کر میں نے سارا واقعہ سنا دیا اسے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔

"منگنی کس سے ہوئی ہے؟"

"خدا جانے کون ہے۔ مگر وہ کوئی بھی ہو۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ثریا کسی اور سے بیاہی جا رہی ہے۔ جس کے پودے کو میں نے اپنے دل کے خون سے سینچا تھا اس کا پھل کسی دوسرے کی جھولی میں گر رہا ہے۔"

"ثریا پر اس کا کیا اثر ہوا ہے؟"

"وہی جیسا کہ عام طور پر اس قسم کی لڑکیوں پر ہوا کرتا ہے۔ وہ رو رہی تھی اور مجھے یقین ہے وہ اسی طرح روتے ہوئے ایک دن ڈولی میں سوار ہو جائے گی۔"

سعید اور میں اس کے مکان کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ سعید نے سگریٹ مجھے دیتے ہوئے کہا:

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ تم نے کیا سوچا ہے؟"

میں ایک پل کے لیے خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ پھر راکھ جھاڑ کر بولا:

"تمہارے خیال میں کیا سوچنا چاہیے؟"

"یہ تو اب تمہارے اندازِ فکر پر منحصر ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ اب تم لوگوں کو ایک دوسرے کو بھلا دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

میں سعید کے اس جواب سے سٹ پٹا گیا۔

"تم ہر وقت ناصح بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔ دوست بن کر بھی کبھی مشورہ دیا کرو۔"

اس قسم کا مشورہ صرف ایک دوست ہی دے سکتا ہے۔ خالد میں دشمن ہوتا تو تمہیں کسی اور راستے پر لگا دیتا۔"

"خاطر جمع رکھو میں اسی راستے پر چل رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں ثریا کو یہاں سے بھگا کر کراچی لے جاؤں گا اور وہاں شادی کر لوں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

سعید نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں ہرگز ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تمہیں اپنی اور ثریا کے گھر والوں کی عزت کا پاس ہونا چاہیے۔ یاد رکھو وہ لوگ تمہیں زندگی بھر معاف نہ کریں گے۔ بوڑھی ماں کا دل توڑ کر تم کبھی سکھی نہ رہ سکو گے۔"

"یہ پرانی باتیں ہیں سعید۔ کوئی نئی بات کرو۔"

"اگر عشق پرانا جذبہ ہے تو ماں باپ کے عزت بھی کبھی نہیں بدل سکتی۔ یہ دونوں

خط ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔ مجھے یقین ہے ایسی کوئی حرکت نہ کرو گے جس کی وجہ سے تمہارے اور ثریا کے والدین کو ایک دوسرے سے شرمندہ ہونا پڑے اور پھر ایسی حالت میں جبکہ ثریا کی منگنی ہو چکی ہے۔ ثریا کے بھائی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ ماں غم سے پاگل ہو جائے گی اور خواہ مخواہ ایک غلطی سے سارا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ یاد رکھو ایسے عالم میں ثریا تم سے کبھی پیار نہ کر سکے گی۔

میں چپ بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ سعید ویسے تو بالکل سچی باتیں کر رہا تھا۔ اگر میں نے ثریا کو اغوا کر لیا تو عین ممکن ہے کہ بعد میں ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں۔ مگر یہ کس طرح گوارہ کر لوں کہ ثریا کو کوئی دوسرا شخص بیاہ کر لے جائے۔

یہ تصور مجھے پاگل بنائے جا رہا تھا کہ ثریا حجلۂ عروسی میں دلہن بنی بیٹھی ہے اور ایک غیر مرد خاوند بنا اندر داخل ہو کر اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اس سے بھی اذیت ناک منظر وہ تھا جب میں خیال ہی خیال میں ثریا کو دیکھتا کہ وہ ہنس ہنس کر اپنے خاوند سے باتیں کر رہی ہے ہم مشرقیوں کی تمام مصیبتوں کی جڑ ہمارا جذبۂ ملکیت ہے۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں پھر اس کے گرد خاردار باڑ لگا کر ایک تختی پر اپنا نام لکھ دیتے ہیں۔ کیا ہم اپنی محبتوں کو آزاد اور فطرت کی آغوش میں پرندوں کی طرح کھلا نہیں چھوڑ سکتے؟ مگر اس کا کیا علاج کہ ملکیت کا یہی جذبہ بیشتر جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے

سعید بولا:

"تمہیں اس معاملے پر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنا ہوگا خالد۔ یہ بچوں کا کوئی کھیل نہیں ہے۔ تم دو خاندانوں کی عزت اور وقار سے کھیلنے والے ہو۔ پہلے یہ سوچ لو کہ کیا تمہیں اس جرأت کا حق بھی ہے؟"

"حق سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"یہی کہ کیا تم دونوں کی محبت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ تم لوگ اپنے اپنے خاندان کا ناموس مٹی میں ملا دو؟ خاص طور پر جبکہ اس کی ماں اور بھائی اس کی منگنی کہیں اور طے کر چکے ہیں۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا:

"تم میرا سر نہ کھاؤ۔ اس موضوع کو اب ختم کرو۔"

سعید مسکرانے لگا۔

اچھا لو ختم کئے دیتا ہوں۔ اب سیاست کی بات کرتا ہوں۔ تم نے سنا ہے کہ کل عورتوں کا ایک بہت بڑا جلوس نکل رہا ہے؟"

"وہ کیا کرے گا؟"

"کوتوالی کی عمارت پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگائے گا۔"

"جلوس لگائے گا یا کوئی لڑکی"

"ظاہر ہے کوئی لڑکی ہی یہ کام سرانجام دے گی۔ میں نے کل چھٹی لے لی ہے۔ تم دس بجے میرے ہاں آجانا۔"

میں کل پہنچنے کا وعدہ کرکے سعید کے گھر سے نکل آیا۔ سعید میرے ساتھ دروازہ مان سنگھ تک آیا۔

دوسرے روز ہم دس بجے کے بعد ہال بازار میں کوتوالی کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں بڑی پولیس کھڑی تھی۔ ایک طرف گھوڑا سوار پولیس کے دستے تھے دوسری طرف چاق و چوبند گورکھا اور سکھ فوج کے دستے کھڑے تھے۔ مجھے اچانک خیال آگیا کہ یہی وہ فوج تھی جس کے سپاہیوں نے اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے پروانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ مگر آج پنجاب کا مسلمان بیدار ہو چکا تھا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انگریز کی غلامی کا جوا اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے سردھڑ کی بازی لگا دی تھی۔

بیداری کے اس لہر نے عورتوں اور بچوں کو بھی میدان عمل میں کھینچ لیا تھا۔ ہال بازار میں مسلح پولیس گشت کر رہی تھی۔ ہم نے سنا کہ جلوس ہال دروازے میں داخل ہو گیا ہے۔ ہم اس طرف چل پڑے۔ دکانوں کے تختوں اور مکانوں کی کھڑکیوں میں بے شمار لوگ جلوس دیکھنے کے لئے کھڑے تھے۔

یہ جلوس ہمیں مسجد خیرالدین کے پاس ملا۔ کوئی ہزار دو ہزار مسلمان خواتین ہوں گی۔ تقریباً سب کی سب برقع پوش تھیں۔ وہ "پاکستان زندہ باد" "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگاتی لیگ کا سبز پرچم اٹھائے کوتوالی کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ جھنڈا اٹھانے والی لڑکی نے سبز کپڑے پہن رکھے تھے جو مسلم لیگ کے جھنڈے کا رنگ تھا۔ موسم

خوشگوار ہونے کے باوجود اس لڑکی کا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ وہ پردے کے بغیر تھی اور آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگی ہوئی تھی۔

اس لڑکی کے جوش و خروش کو دیکھ کر ہر شخص اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ اب دوسرے اردگرد کھڑے لوگوں نے بھی مٹھیاں بھینچ کر "مسلم لیگ زندہ باد" "پاکستان پائندہ باد" اور "خواتین اسلام زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ پولیس کی بھاری جمعیت اس جلوس کے ساتھ ساتھ تھی۔ مگر کسی سپاہی کی مجال نہیں تھی کہ وہ کسی عورت کو روک سکے۔

جب یہ جلوس کوتوالی کے سامنے پہنچا تو وہاں دونوں طرف کھڑے گھڑ سوار دستے چوکس ہو گئے۔ جلوس کوتوالی کے سامنے جا کر رک گیا۔ عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کر اور مٹھیاں لہرا لہرا کر "اسلام زندہ باد" "پاکستان زندہ باد" کے پرجوش نعرے لگانے لگیں۔ ڈی ایس پی جو ایک شریف النفس سکھ تھا آگے بڑھا اور جلوس کی قیادت کرنے والی خاتون کے پاس جا کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا کہ شہر میں دفعہ 144 لگی ہوئی ہے۔ انہیں جلوس کو منتشر کر دینا چاہیئے۔

قائدہ جلوس نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ وہی سنہری عینک والی علم بردار لڑکی قطار میں سے بھاگ کر کوتوالی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زنانہ پولیس کی دو عورتیں اس کے پیچھے دوڑیں۔ اس لڑکی نے سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر "پاکستان زندہ باد" کا ایک پرجوش نعرہ لگایا اور جلوس ٹوٹ کر اوپر چڑھنے کے لئے اٹھ دوڑا۔ عین اس وقت پولیس نے اوپر تلے چار آنسو لانے والے بم پھینک دیئے۔ یکے بعد دیگرے چار دھماکے ہوئے اور فضاء میں اشک آور دھواں ہی دھواں بھر گیا۔۔۔۔

عورتوں نے فوراً گیلے رومال منہ پر ڈال لئے۔ ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی اور کھانس کھانس کر لوگوں کا برا حال ہو گیا۔

ان عورتوں کے ساتھ اب مسلمان مرد بھی شامل ہوگئے۔ انہوں نے کوتوالی کی عمارت پر دھاوا بول دیا۔ پولیس کے دوسرے دستے نے عورتوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ عورتیں زمین پر بیٹھ گئیں اور نعروں کی آوازوں سے کوتوالی کے در و دیوار گونج اٹھے۔ کوتوالی کی سیڑھیوں پر شور قیامت بپا تھا۔ وہ سنہری عینک والی لڑکی اچانک کوتوالی کی چھت پر نمودار ہوئی۔ اس نے تن کر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور چھت پر مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔

جھنڈا جنوری کی تیز ہوا میں پھڑ پھڑانے لگا۔ اسے لہراتا دیکھ کر مسلمان مردوں اور خواتین کے دلوں میں مسرت اور جوش کا طوفان امڈ آیا۔ انہوں نے "اسلام زندہ باد" "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔

اب گورہ پلٹن آگے بڑھی اور انہوں نے آتے ہی ہوا میں فائرنگ شروع کر دی۔ لوگ فائرنگ کی آواز سن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس نے اوپر جاکر سنہری عینک والی لڑکی کو گرفتار کرنا چاہا۔ مگر اس نے جانے جوش اور شدت جذبات کے کس عالم میں کوتوالی کی چھت پر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ہر شخص دم بخود ہو کر رہ گیا۔ لڑکی ایک فوجی ٹرک کے اوپر آکر گری اور گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اسے سخت زخمی حالت میں فوراً ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

زنانہ پولیس نے کئی عورتوں کو زبردستی موٹروں میں بٹھلا کر انجمن پارک کے پاس جا کر چھوڑ دیا۔

شہر میں ہر طرف اس عینک والی لڑکی کی بہادری کے چرچے ہونے لگے۔ اس کی وطن پرستی کے جذبات کی عظمت سے ہندو اور سکھ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں تک کہ اس دن شام کو شہر کے ایک انسان دوست ہندو نے اس مسلمان لڑکی کو اپنے خرچ پر ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں داخل کروانے کی پیش کش کی جسے مسلمانوں نے قبول نہ کیا۔

شہر کے مسلمانوں نے اس لڑکی کا اپنے خرچ پر علاج کروایا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ اور سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اب مسلمانوں کے ہر محلے اور ہر گلی میں پاکستان کے حصول کی لہر شدت اختیار کر گئی۔ کانگریس پریشان ہو گئی۔ اکالی برہم ہوگئے انہوں نے پاکستان کے خلاف جلوس نکالنے شروع کر دیئے۔ شہر میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہندوؤں کی کنتنتری پارٹی نے بھی جلوس نکالنے شروع کر دیئے۔ لیکن انہوں نے پاکستان

کے خلاف کوئی نعرہ نہ لگایا تھا۔

مسلم لیگ نے سکھوں کو ان کی ایک الگ ریاست بنوانے کی پیش کش دے کر انہیں اپنی تحریک شامل کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے لیگ میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے کانگریس سے گٹھ جوڑ کر لیا اور پاکستان کے خلاف کھلے لفظوں میں زہر اگلنے لگے۔ یہی رویہ پرتاپ، ملاپ، اور پربھات اخباروں نے اختیار کر رکھا تھا۔

کوتوالی پر لیگ کا جھنڈا لگانے کے بعد ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران شہر میں تقریباً ہر روز جلوس نکلتا رہا۔ لیکن شہر کی کاروباری زندگی پر اس کا زیادہ اثر نہ پڑا تھا۔ لوگ پر اشتیاق ضرور تھے مگر خائف ابھی نہیں ہوئے تھے۔ لڑکیوں کے سکول باقاعدہ کھلتے تھے۔ اس اثناء میں ثریا سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ نہ میں اس سے ملنے گیا اور نہ اس نے ہی مجھے بلایا۔ میرا دل اس کو دیکھنے کو تڑپ رہا تھا مگر ضد کہتی تھی کہ جب تک وہ خود نہ بلائے گی میں اس کے سکول نہ جاؤں گا۔ آخر وہی ہوا۔ ایک روز سعید نے ثریا کا خط لا کر دیا۔ ثریا نے مجھے بلوا بھیجا تھا۔ خط میں صرف اتنا لکھا تھا۔

------ اتنی جلدی اتنی ذرا سی بات پر ناراض ہو گئے۔ اس طرح یہ ساری زندگی کیسے گزرے گی؟ کیا کل آئیں گے۔ میں چھٹی کے بعد راہ دیکھوں گی۔

آپ کی

ثریا

یہ خط پا کر میرے جذبۂ خود پسندی کو بڑی تسکین ہوئی۔ تو کیا وہ ساری زندگی میرے ساتھ بسر کرنے کے متعلق سوچ رہی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر اس کے دل میں کیا ہے؟

میں اس بات کا جواب لینے کے لیئے چھٹی کے وقت اس کے سکول پہنچ گیا۔ چونکہ شہر کی فضا ہنگامہ پرور تھی اس لیے میں نے سڑکوں پر گھومنا یا ہوٹل میں اسے لئے کر جانا مناسب خیال نہ کیا۔ بلکہ اسے سعید کے گھر لے آیا۔ سعید کا نچلا کمرہ اس قسم کا تھا کہ اس کی ایک کھڑکی دوسری گلی میں کھلتی تھی۔ میں ثریا کو لے کر سیدھا اس کے گھر آگیا۔ سعید نے ہمیں اندر داخل کیا اور خود کھڑکی کے راستے باہر نکل کر کمرے کے دروازے پر باہر سے تالا ڈال دیا۔ چابی وہ اپنے ساتھ لیتا گیا۔

کمرہ بڑا مختصر لیکن سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ فضا میں فروری کے دنوں کی بڑی خوشگوار خنکی تھی جو بڑی بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی اندر سے بند کر لی سب دروازے کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف روشن دان کھلے تھے۔ جن سے ہلکی ہلکی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں اور ثریا صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ایش ٹرے تپائی پر اپنی طرف کر لیا۔ اور چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں ثریا سے بات کرنے کے لئے ہزاروں باتیں تھیں مگر میں اس وقت تک ثریا سے بات نہیں کرنی چاہتا تھا جب تک کہ وہ اس موضوع کو خود نہ چھیڑتی۔

ثریا بولی:

"آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

"قصور مجھ سے نہیں اپنے دل سے پوچھو؟"

"میرا دل تو چشمے کی طرح شفاف ہے۔"

"اور پتھر کی طرح سخت اور ٹھنڈا بھی ہے۔"

"اگر یہ بات ہوتی تو آپ کی محبت کی گرمی سے کبھی نہ پگھلتا۔"

"اس میں تمہارے دل کی نہیں میری محبت کی خوبی ہے۔ عشق سچا ہو تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔"

ثریا خاموش ہو گئی۔ اس نے بڑی خوبصورت پھولدار قمیض پہن رکھی تھی اور کانوں میں رولڈ گولڈ کی سنہری چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ اس کے جسم سے وہی حنا کی عطر کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا جس روز اس کی شادی ہو گی اس کا سارا جسم عطر میں ڈوبا ہوا ہو گا۔ پھر مجھے اس آدمی کا خیال آ گیا جو اس کے جسم کا مالک بننے والا تھا۔ میرے کانوں میں شہنائیوں کا شور گونج اٹھا اور حلق میں کوئی کڑوی شے اترتی محسوس ہوئی۔"

"ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھیے۔"

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم شادی کسی دوسرے سے کرو اور زندگی میرے ساتھ بسر کرو۔"

"کبھی نہیں۔"

"پھر تم نے اپنے خط میں کیا لکھا تھا کہ اس طرح یہ ساری زندگی کیسے گزرے گی۔"

"اس لیئے کہ میں شادی بھی آپ ہی سے کروں گی۔"

میں حیرت زدہ سا ہو کر ثریا کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر محبت کی ایک عجیب دل آویز موہنی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں کے گہرے اسرار و رموز کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ ماتھے پر آئے ہوئے کچھ بال ہلکے سے پسینے میں پیشانی سے چپک گئے تھے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

ثریا ذرا سا مسکرا دی۔

"یہی کہ میں آپ سے شادی کر لوں گی۔"

"مگر وہ کیسے؟"

"جیسے ہوا کرتی ہے۔"

"کیا منگنی توڑ دو گی؟ تم ایسا کر سکتی ہو؟ تم ایسا کبھی نہیں کر سکتیں، ہرگز نہیں۔"

"کیوں نہیں کر سکتی؟"

"تم کمزور ہو۔ خاندانی پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو۔ تم اگر چاہو بھی تو ان زنجیروں کو نہیں توڑ سکتیں۔"

"بارش کا وہ پہلا چھینٹا جو بڑی بے کسی سے ریت پر گرتے ہی جذب ہو جاتا ہے بعض اوقات کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بظاہر ایک ناتواں سی لڑکی ہوں اور خاندانی روایات میں جکڑی ہوئی ہوں۔ مگر کبھی کبھی پھل کا بیج اس کے چھلکے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔"

"آخر تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟ تمہارے پاس اس کا حل کیا ہے۔"

ثریا نے دوپٹہ سر پر کر لیا۔ کیونکہ وہ بات کے دوران کھسک کر اس کے کندھوں پر آن گرا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی چوڑیاں بج اٹھیں۔

"میں گھر والوں سے صاف کہہ دوں گی کہ میں یہ شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"وہ اس کی وجہ پوچھیں گے۔"

"میں کہہ دوں گی کہ میں خالد سے پیار کرتی ہوں۔"

"اگر انہوں نے منگنی توڑنے سے صاف انکار کر دیا تو؟ ------ تو کیا کرو گی؟"

"وہ ایسا نہیں کریں گے۔ میں اپنی والدہ اور بھائیوں کو جانتی ہوں وہ لوگ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ وہ میری خوشیوں کو آگ نہیں لگائیں گے۔"

"کیسی بچوں ایسی باتیں کر رہی ہو ثریا! تم محض محبوبہ ہو اور وہ بھائی ہیں، ماں ہے جنہوں نے بھری پنچایت میں بیٹھ کر سب کے سامنے تمہاری منگنی کا اعلان کر رکھا ہے۔ وہ یہ بے عزتی کیسے گوارا کریں گے۔"

"میں جانتی ہوں وہ میری بات مان جائیں گے۔"

"اگر فرض کیا انہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو پھر تم کیا کرو گی۔"

"ثریا یہاں آ کر خاموش ہو گئی۔ جس بات کو سننے کے لئے میں وہاں آیا تھا وہی بات اس کی زبان پر نہیں آ رہی تھی۔"

"بولو ثریا پھر تم کیا کرو گی۔ کیا گھر سے بھاگ کر میرے پاس آ جاؤ گی؟ پھر ہم دونوں کراچی جا کر شادی کر لیں گے ثریا! میری بہن مسعودہ بھی شریک ہو گی۔ شادی کے بعد ہم دونوں میاں بیوی تمہاری والدہ اور بھائیوں کے سامنے آ جائیں گے اور ان سے اپنے کئے کی معافی مانگ لیں گے۔"

ثریا ایک دم بولی:

"نہیں نہیں خالد! پھر وہ کبھی معاف نہیں کریں گے۔ تم میرے بھائیوں کو نہیں جانتے۔ وہ کبھی مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ان کی پیشانی پر بدنامی اور ذلت کا کلنک لگا کر میں شادی کی خوشیاں نہیں منا سکتی۔"

میں نے براہ راست سوال کیا۔

"تم بھائیوں سے ڈرتی ہو یا اپنے ضمیر سے۔"

"دونوں سے ------ نہ اپنے بھائیوں کو ذلیل کر سکتی ہوں اور نہ اپنے ضمیر کو داغ دار کر سکتی ہوں۔ دونوں صورتوں میں میرے لئے زندہ رہنا تو محال ہو جائے گا۔"

"تو پھر محبت کیوں کی تھی۔"

ثریا سٹ پٹا سی گئی۔

"محبت؟ آخر انسان کو ذلیل کرنے کے لئے تو نہیں ہے۔ محبت تو اسے عزت اور خوشی عطا کرتی ہے نہ کہ اس کی نکیل میں ذلت کی رسی ڈال کر اسے گلی گلی رسوا کرتی پھرے۔"

"تو اس کا مطلب ہوا کہ اگر تمہارے گھر والے تمہاری بات نہ مانے تو تم ان کی مرضی کے مطابق شادی کر لو گی۔"

"وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔"

ثریا اصل بات کی طرف بالکل نہیں آ رہی تھی۔ جو اعتراف میں اس کی زبان سے کروانا چاہتا تھا وہ اس سے کوسوں دور بھاگ رہی تھی۔ ایک بار میرے دل میں بھی خیال آیا کہ شاید اس کے گھر والے اس کی بات مان لیں مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ بھلا کبھی ایسا ہوا ہے۔ اگر منگنی نہ ہوئی ہوتی تو کسی حد تک اس کا امکان تھا۔ لیکن منگنی کے بعد تو ان سے ایسا سوال کرنا ان کی براہ راست بے عزتی تھی۔

میں نے ثریا سے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر دوسرے صوفے پر جا کر لیٹ گیا اور ہاتھ سینے پر باندھ کر چھت کو تکنے لگا۔ ثریا نے بھی اپنا سر صوفے کی پشت سے لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ میں خیالات کا حشر برپا تھا۔

کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ کبھی کبھی اس خاموشی کو گلی میں گزرتے ہوئے کسی پھیری والے کی آواز توڑ دیتی۔ اس کے بعد پھر وہی سکوت طاری ہو جاتا۔ مجھے ثریا کی اس وقت کی خاموشی بڑی بری محسوس ہو رہی تھی۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ چپ چاپ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ میں جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔

"چلو چلیں ------ مجھے یہاں وحشت ہونے لگی ہے۔"

ثریا ایک دم صوفے سے اٹھی اور مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ پہلے تو میں دم سادھے چپ کھڑا رہا پھر میرا دل پسیج گیا۔ کیونکہ مجھے اس لڑکی سے محبت تھی اور بڑی شدید محبت تھی۔ میں نے ثریا کو ماتھے پر پیار کیا اور اس کے شانوں پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔

"جی ہلکا نہ کرو ثریا! کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اگر میں تمہاری زندگی سے نکل بھی گیا تو تمہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ سورج اسی طرح ہر روز مشرق سے طلوع ہو گا۔ برسات

کی لمبی لمبی جھڑیاں اسی طرح لگا کریں گی اور تمہارا خاوند مجھ سے بھی بڑھ کر تم سے پیار کرے۔۔۔۔۔"

ثریا مجھ سے چمٹ گئی اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"خدا کے لئے میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکیں۔ میں پہلے ہی بڑی دکھی ہوں۔ میں یہ باتیں نہیں سن سکتی، کبھی نہیں سن سکتی۔ دیکھ لیں اگر ایسا ہو گیا تو میں جان دے دوں گی۔ زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

میں اس کے سیاہ بالوں کو سہلاتے ہوئے ہنس پڑا "لڑکیاں ایسے ہی کہا کرتی ہیں اور جب وقت آتا ہے تو چپکے سے ڈولی میں سوار ہو کر میکے سے چل دیتی ہیں۔ اندھیری راتوں میں چھپ چھپ کر باندھے گئے پیمان بے جان تنکے بن کر ہوا کے ساتھ اڑ جاتے ہیں۔ محبت کی سرگوشیاں کہیں ڈوب جاتی ہیں۔ محبت کے بوسوں کے نشان شادی کی لپ سٹک کے نیچے دب جاتے ہیں۔ ہر دم یاد آنے والے پھر کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آتے۔ محبوب کی محبت خاوند کے احترام میں گم ہو جاتی ہے اور جب بچہ ہو جاتا ہے تو عورت کنوارپنے کی حرکتوں کو حماقت کے نام سے یاد کرتی ہے اور تنہائی میں اپنے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے ان باتوں پر مسکرا دیتی ہے جن پر کبھی وہ گھنٹوں آنسو بہایا کرتی تھی۔ جس طرح کہ تم اس وقت آنسو بہا رہی ہو۔"

میں نے جیب سے رومال نکال کر ثریا کو دیا۔

"یہ لو رومال اور ان آج کے آنسوؤں اور کل کی مسکراہٹوں کو رخساروں پر سے پونچھ ڈالو۔"

ثریا نے رومال سے آنسو خشک کئے۔ اس کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں۔ وہ بے جان سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی اور بوجھل آواز میں بولی:

"میں ان لڑکیوں سے مختلف ہوں خالد، آپ نے جو کچھ کہا اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر میرے ساتھ ایسا نہ ہو گا۔ میں دنیا کی ہر شے سے غافل ہو سکتی ہوں لیکن آپ کو دل سے محو نہیں کر سکتی۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں اگر چاہوں بھی ایسا نہیں کر سکتی۔"

"تو اس سے کیا ہو گا۔ جب تم میرے پاس نہیں ہو تو مجھے یاد رکھنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ یہ نہ صرف میری بلکہ شادی کے مقدس رشتے کی بھی توہین ہے کہ تم آغوش میں کسی

دوسرے کی پڑی رہو اور یاد مجھے کرتی جاؤ۔ میں تمہیں اس جسارت کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔ یا تو میرے پاس آ جاؤ۔ اگر نہیں آ سکتیں تو جہاں۔ تمہاری شادی ہو وہیں رہو اور اپنے خاوند سے محبت کرو اور اس کے گھر کو سورگ بنانے کی کوشش کرو۔ بجائے اس کے کہ مجھے دوزخ میں ڈال کر اس بے چارے کی زندگی کو بھی جہنم میں بدل دو۔ خاوند کے گھر میں آگ لگانے سے ماں باپ کی تھوڑی سی بدنامی سہہ لینا کہیں بہتر ہے۔ لیکن ایک رستے بستے گھر کا سکھ چین تباہ کرنا انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے اور میں تمہیں ایسا کبھی نہیں کرنے دوں گا۔ میری ساری کوششیں تمہاری شادی تک محدود ہوں گی۔ اگر میں ناکام ہو گیا اور تمہارے ہونے والے خاوند کی جیت ہو گئی تو میں تمہیں کبھی یاد نہیں کروں گا۔ کم از کم تم سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کروں گا۔ کیونکہ اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ دوسرے کی بیوی پر بُری نگاہ ڈالوں۔ ابھی وقت ہے۔ ایک بار پھر اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ جب وقت گزر گیا تو ہاتھ ملنے سے کچھ نہ ہو گا۔"

ثریا میری باتیں بڑے گہرے انہماک سے سن رہی تھی۔ جب میں نے بات ختم کی تو چند لمحوں کے لئے تو مجھے ٹکٹکی لگائے تکتی ہی رہی۔ پھر آنکھیں جھپک کر اس نے آنکھ بند کر لیں اور سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔

"نہیں خالد! میں گھر سے نہیں بھاگ سکتی۔ اس گھر سے میری ڈولی نکلے گی یا جنازہ۔۔۔۔۔ میں اس گھر سے بھاگ نہیں سکتی۔"

"لیکن تمہیں بھاگنے کا کون کہتا ہے۔ تم بے شک آرام سے نکلنا اور پھر شادی کے بعد بڑے آرام سے اسی گھر میں آن داخل ہونا۔"

"میرے قدم کبھی میرا ساتھ نہ دیں گے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ میں اپنے بھائیوں اور ماں کے اعتماد کو یہ صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ میں انہیں ویسے راضی کر لوں گی۔ میں آگ لگنے سے پہلے اپنے گھر کو بچا لوں گی۔ میں جانتی ہوں وہ کوئی نہ کوئی وجہ بنا کر منگنی کو توڑ دیں گے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہارے پاس ایک دلیل بھی اتنی مضبوط نہیں جو انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر سکے۔ محبت؟ ماں باپ کے سامنے بچوں کا کھیل ہوتا ہے۔ ضدی بچے کا رونا ہوتا ہے جسے وہ جب چاہیں ذرا سی جھڑک سے چپ کرا سکتے ہیں۔"

"وقت آنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

"وہ سب کچھ مجھے پہلی ہی معلوم ہے۔ بہر حال میں وقت کا انتظار کر لوں گا۔"

اتنے میں گلی والی کھڑکی پر دستک ہوئی اور اس کے بعد سعید کے تالا کھولنے کی آہٹ سنائی دی۔ سعید تالا کھول کر جلدی سے اندر آگیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا:

"خیریت تو ہے نا؟"

"گول باغ میں پولیس نے لیگ کے ایک بہت بڑے جلوس پر گولی چلا دی ہے۔ سنا ہے کچھ لوگ مر بھی گئے ہیں۔ شہر میں سخت ہراس پھیلا ہوا ہے۔"

ثریا کہنے لگی:

"مجھے جلدی سے گھر چھوڑ آئیں۔"

اس کے فوراً بعد میں اور سعید ثریا کو لے کر اس کے گھر کی طرف چل پڑے۔

مسلم لیگ کا گول باغ میں ایک جلسۂ عام ہو رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شریک تھے۔ پولیس نے دفعہ 144 کے تحت اس جلسے کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان ڈٹے رہے۔ پولیس نے اشک آور گیس پھینکی۔ لوگوں نے لیٹ کر چہروں پر گیلے رومال رکھ لئے جنہیں وہ وہاں لے کر آئے ہوئے تھے۔

پولیس نے لاٹھی چارج کیا تو لوگ "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے جلوس کی شکل میں ہاتھی گیٹ پولیس سٹیشن کی عمارت پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگانے روانہ ہو گئے۔ ہجوم اس قدر تھا اور جوش خروش کا وہ عالم تھا کہ یہ سیلاب کسی کے روکے نہ رکتا تھا۔ پولیس نے اور گھڑ سواروں کے دستے نے ہاتھی گیٹ کے باہر جلوس کو منتشر کرنے کے لئے ایک بار پھر لاٹھی چارج کیا۔ بپھرے ہوئے غضبناک عوام نے پولیس والوں سے ان کی لاٹھیاں چھین کر انہی پر حملہ کر دیا۔ عین اس وقت قلعے کی پریڈ سے گورا فوج آ گئی اور اس نے آتے ہی گولی چلا دی۔ دو تین راؤنڈ ہوا میں اور کچھ راؤنڈ لوگوں کی ٹانگوں میں مارے۔ ایک بھگدڑ مچ گیا۔ زخمی ہو کر گرے ہوؤں کی چیخوں اور بھاگتے ہوؤں کے شور نے وہاں قیامت کا منظر پیدا کر دیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔

جب مطلع صاف ہوا تو چوک میں دس بارہ زخمیوں کے درمیان دو تین مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ پولیس نے لاشوں پر قبضہ جما لیا اور زخمیوں کو ہسپتال مرہم پٹی کے لئے بھیج دیا۔ شہر میں حکومت کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں نے مرنے والوں کی ہمدردی میں ایک دم ہڑتال کر کے اپنی اپنی دکانیں بند کر لیں۔ سیاسی لیڈروں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود بمشکل ایک لاش مل سکی۔ لاش کو لیگ کے سبز جھنڈے میں لپیٹ دیا گیا۔ ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ گورا فوج کی ایک پلٹن جنازے کے ساتھ گئی۔ لوگوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ راستے میں نعرہ بالکل نہ لگایا جائے۔ مگر قبرستان میں پہنچ کر لوگوں نے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

شہر میں اب عجیب قسم کا خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ دم بخود سے ہو کر بیٹھ گئے۔ لال جھنڈیاں سی دکھائی دینے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

مارچ کے بڑے خوشگوار دن تھے۔ کمپنی باغ اور شریف پورے کے لائن پار اور نہر کنارے والے لوکاٹ، آلوچے اور ناخ کے گنجان باغوں میں پھول ابھی ابھی آئے تھے۔ تحصیل پورے سے ریلوے لائن تک جانے والی مشہور پگ ڈنڈی لیموں اور کھٹے کے پھولوں

کی میٹھی خوشبو سے معطر ہو گئی تھی۔ آم کی ٹہنیوں پر بور آ رہا تھا اور درخت بوجھل ہوسی
مہک چھوڑ رہے تھے۔ پھل دار درختوں کی ٹہنیاں رنگ برنگ پھولوں سے لدی پھندی کھڑی
تھیں۔

سویٹ پنیر کے گہرے شوخ رنگوں کے پھول جھاڑیوں میں جابجا کھلے ہوئے تھے۔
کمپنی باغ کے قطعوں میں جدھر نظر اٹھائیے سوائے پھولوں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بہار
اپنے جوبن پر تھی۔ ہوا پھولوں اور درختوں کے تازہ دم پتوں کی خوشبو سے مشکبار تھی۔
فطرت کا یہ عالم تھا اور شہر میں یعنی شہر کی آبادی میں لوگ سیاسی اور مذہبی نظریات کے
جھنڈے اٹھائے نعرے لگاتے ٹولیوں کی شکل میں گلی محلوں میں گھوم رہے تھے۔ ہمارے
شریف پورے میں سارا سارا دن جلوس "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگاتے چکر
لگایا کرتے۔ یہی حال مسلمانوں کے دوسرے محلوں کا تھا۔

اکالی پارٹی نے کانگریس کی شہ پر اب کھلم کھلا مسلم لیگ کی مخالفت شروع کر دی تھی۔
یہ سارا بارود ایک ہلکی سی چنگاری کا منتظر تھا کہ اچانک ایک روز اکالی پارٹی کے لیڈر ماسٹر تارا
سنگھ نے لاہور میں پنجاب اسمبلی کی عمارت کے باہر سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر مسلمانوں
کے ایک جلوس کے نعروں کا جواب تلوار سونت کر ان الفاظ میں دیا:

"ہم مسلمانوں کو تلوار سے پاکستان کا جواب دیں گے۔"

اس ایک جملے نے بارود میں گری ہوئی چنگاری کا کام کیا۔ چاروں طرف ایک شور سا مچ
گیا۔ مسلمانوں کو یہ کبھی امید نہ تھی کہ سکھ انگریز اور ہندو کی سیاست کا آلۂ کار بن کر ان کے
مقابلے پر اتر آئیں گے۔ ناسمجھ سکھ لیڈر کی ذرا سی ناسمجھی نے پوری سکھ قوم اور مسلمان قوم
کے لیے ظلم و ستم کا ایک باب کھول کر رکھ دیا۔ جس کے ہر ہر صفحے پر شہیدوں نے اپنے
خون سے سرخیاں لکھیں۔

ہندوستان اور پنجاب کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں مسلمانوں میں تارا سنگھ کے اس
بیان پر نفرت کا اظہار کیا گیا۔ لاہور اور امرتسر کے جلسوں اور جلوسوں میں اب ماسٹر تارا سنگھ
کے اس اشتعال انگیز بیان کے خلاف بھی نعرے لگنے لگے۔

4 مارچ 1947ء کی تاریخی صبح طلوع ہوئی۔

میں نے صبح کی سیر سے واپس آ کر نہا دھو کر چائے پی اور دل میں یہ سوچ کر کہ تر

سے اب دو ٹوک بات کرنی چاہیئے اسے ایک طویل خط لکھنے کے ارادے سے اپنی شہ نشین میں
آ گیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ قلم اور سیاہی تو موجود ہے لیکن لکھنے کے پیڈ نہیں رہے۔ میں
ہمیشہ کراکسلے کا کریم کلر پیڈ استعمال کرتا تھا۔ اور یہ پیڈ سوائے ہال بازار والی گول ہٹی سے اور
کہیں نہیں ملتا تھا۔ اس وقت دن کے پونے دس بج رہے تھے۔ میں نے سائیکل پر پاؤں رکھا
اور دروازہ مان سنگھ میں سے ہو کر سیدھا ہال بازار میں آ گیا اور گول ہٹی جو سکھوں کی منیاری اور
دوسرے سامان کی بہت بڑی دکان تھی، پر پہنچ کر کراکسلے کا پیڈ نکلوانے لگا۔ اس دکان پر
گاہکوں کا اکثر ہجوم رہا کرتا۔ کیونکہ یہاں مال بڑا اپ ٹوڈیٹ اور قابلِ اعتبار ہوتا تھا۔ میں نے
پیڈ خرید کر ابھی پیسے دکاندار کو دیئے ہی تھے کہ اچانک اکالی سکھوں سے بھرا ہوا ایک تانگہ آ کر
گول ہٹی میں رکا۔ اس تانگے میں نہنگ سکھ سوار تھے اور انہوں نے تانگے کی پچھلی جانب
ایک نقارہ رکھا ہوا تھا۔

چوک میں آ کر انہوں نے دھنادھن نقارہ بجانا شروع کر دیا۔ لوگ تانگے کے ارد گرد
کھڑے ہو گئے۔ نقارہ بجنا بند ہوا تو اگلی سیٹ پر ایک سکھ نے کھڑے ہو کر تقریر شروع
کر دی۔ تقریر کیا تھی مسلمانوں کو ایک اچھا خاصا انتباہ تھا کہ وہ سکھوں کے گوروں کی نگری
امرتسر میں پاکستان کے مطالبے سے باز آ جائیں کیونکہ یہاں سکھ قوم ان کا پاکستان کبھی نہیں
بننے دے گی۔ مسلمان بڑے ضبط کے ساتھ کھڑے سنتے رہے۔ جب نہنگ سکھ نے یہ جملہ
کہا۔

"اور اگر وہ باز نہ آئے تو پھر (کرپان ہوا میں لہرا کر) امرتسر میں ان کا پاکستان نہیں
قبرستان بنے گا۔" تو

مجمع میں سے ایک بوڑھے مسلمان نے کہا:

"بکواس بند کرو۔"

نہنگ سکھ نے اس مسلمان کی داڑھی پر زور سے تھوک دیا۔

"اوئے مسلیا تیرا اوی قبرستان بناواں گے۔"

اب فضا میں "پاکستان زندہ باد" کا ایک فلک شگاف نعرہ گونجا اور رام باغ کے ایک
کڑیل جوان مسلمان نے اچک کر اس سکھ کو تانگے پر سے نیچے گرا لیا اور گھونسوں سے اس کی
مرمت شروع کر دی۔ تانگے میں موجود باقی سکھ ست سری اکال کا نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے

ہوئے۔

اب گول ہٹی والے سکھوں نے کیا کیا کہ دکان کے اندر سے میان میں رکھی ہوئی تلواروں کا ایک گٹھا لا کر ان سکھ نہنگوں کے طرف اچھال دیا۔ سکھوں نے وہ تلواریں بے نیام کرلیں اور نہتے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ میری سائیکل وہیں پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اس پر پاؤں رکھا اور رام باغ کے طرف آگیا۔

چوک گول ہٹی میں اس روز وہ بوڑھا سفید داڑھی والا مسلمان شہید ہو گیا اور دس بارہ دوسرے مسلمان جو اپنے اپنے کام کو جا رہے تھے سخت زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیئے گئے۔ ایک دم پولیس وہاں پہنچ گئی۔ پولیس نے لاش پر قبضہ کر کے اسے بالکل ہی غائب کر دیا۔ ہال بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگوں نے دکانیں بند کرلیں۔ بازار ایک دم خالی ہو گیا۔ پولیس کے گھڑسوار دستے شہر میں ایک دم گشت کرنے لگے۔

شریف پورے میں چوک گول ہٹی والے حادثے کی خبر سب سے پہلے میں نے دی۔ یہاں لوگوں نے اس خبر کو انتہائی افسوس کے ساتھ سنا بیدار مغز لوگوں نے سکھوں کی کم عقلی اور عاقبت نا اندیشی پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس جھڑپ میں ایک اکالی نہنگ بھی سخت زخمی ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ہسپتال میں شام ہی کو اس کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن کے سکھ اور ہندو اخباروں نے اس کی تصویر پہلے صفحے پر چھاپی اور بڑے اشتعال انگیز نوٹ لکھ کر سکھ قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنا شروع کر دیا۔

اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن دوپہر کے وقت سکھوں کا ایک بہت بڑا جلوس دربار صاحب سے نکلا اور گورو بازار سے ہوتا ہوا جب جلیانوالے باغ کے پاس آیا تو اس نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ یہاں مسلمانوں کی چند ایک دکانیں تھیں۔ انہوں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دکانیں بند کرلیں اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ نہنگوں نے ان میں سے ایک مسلمان کو پکڑ کر بازار میں مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ جب دوسرے مسلمان نے اعتراض کیا اور اسے بچانے کی کوشش کی تو ایک نہنگ سکھ نے اچانک کرپان نکال کر پہلے مسلمان کے پیٹ میں گھونپ دی۔ دوسرے مسلمان بھاگ اٹھے۔ اب اس نہنگ نے مسلمان دکاندار کی تڑپتی ہوئی لاش کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔

"بن کے رہے گا پاکستان"

"بن کے رہے گا قبرستان"

جب یہ خبر شہر میں پہنچی تو مسلمانوں میں غم و غصہ کی شدید لہر دوڑ گئی۔ منہ زور مسلمان جوانوں کو بڑے بوڑھوں نے بڑی مشکل سے روکے رکھا ہوا تھا۔

کیونکہ قائداعظم نے انہیں تلقین کر رکھی تھی کہ تشدد سے کسی حالت میں بھی کام نہ لیا جائے مگر اس اندوہناک قتل کے بعد ان کا دامن صبر بھی ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

رام باغ کے مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ آگ گول ہٹی والوں کی لگائی ہوئی ہے۔ اگر وہ تلواریں سکھوں کی طرف نہ اچھالتے تو اتنا زبردست ہنگامہ نہ کھڑا ہوتا اور وہاں ایک مسلمان بزرگ بھی شہید نہ ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے راتوں رات گول ہٹی کی تینوں دکانوں کو آگ لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کام کے لیے چار جوان تیار ہوئے۔ انہوں نے مٹی کے تیل کا ایک کنستر ساتھ لیا اور آدھی رات کو جبکہ ہال بازار میں خاموشی طاری تھی اور صرف کبھی کبھی گھڑسوار پولیس کا گشتی دستہ وہاں سے گزر جاتا تھا۔ انہوں نے زمین پر جھکے جھکے گول ہٹی کے پھاٹک پر جا کر یہاں سے وہاں تک مٹی کے تیل کا سارا کنستر انڈیل دیا۔ تیل انڈیل کر وہ واپس آگئے۔ ان میں سے پھر ایک لڑکا ماچس لے کر وہاں گیا اور دیا سلائی جلا کر دکان کے پھٹے کو آگ لگا دی۔

امرتسر میں فسادات کی آگ کا یہ پہلا شعلہ تھا جو گول ہٹی کے چوک سے بلند ہوا اور پھر سارے پنجاب میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتا ہوا شاہ عالمی دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راکھ کا ڈھیر بنا کر خود بھی بھسم ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے دکان کے پھٹوں پر لہراتے ہوئے دروازوں سے لپٹ گئے۔ اور آن کی آن میں انہوں نے ساری دکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان تینوں دکانوں میں سے ایک دکان ایسی تھی جہاں وارنش کے بہت سے ڈرم پڑے ہوئے تھے۔ جب آگ یہاں تک پہنچی تو ڈرم دھماکے سے پھٹنا شروع ہو گئے۔ آگ اس قدر شدید تھی کہ اس کے شعلے ہمیں شریف پورہ کے مکانوں کی چھتوں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ فائر بریگیڈ والے رات بھر آگ بجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ بڑی مشکل سے صبح آگ پر قابو پایا گیا لیکن دکانیں اور پوری عمارت پوری طرح جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اس کے جواب میں اسی

رات سکھوں اور ہندوؤں نے مل کر جلیانوالہ میں مسلمانوں کی تین دکانوں کو آگ لگا دی اور مسلمانوں کے مکانات لوٹ لئے اور دو مسلمانوں کو کرپانیں مار مار کے شہید کر دیا۔

اب شہر میں باقاعدہ فسادات شروع ہوگئے۔

مسلمان محلوں میں غیر مسلموں کا اور غیر مسلم محلوں میں مسلمانوں کا اعلانیہ قتل عام شروع ہو گیا۔ شہر قتل و خون کا گہوارہ بن گیا۔ زمین بے گناہوں کے خون سے لالہ زار ہو گئی۔ گورکھا اور بلوچ فوج کی بھاری رجمنٹیں شہر میں بلالی گئیں اور شہر کو فوج کے سپرد کر دیا گیا۔

سات مارچ کی صبح کو ہوائی جہازوں کے ذریعے شہر میں اشتہارات پھینک کر دو دن کے زبردست کرفیو کا آغاز کر دیا گیا۔ اشتہار کی پوری عبارت اس طرح تھی۔ اشتہار اردو اور گورمکھی میں چھپا ہوا تھا۔ سب سے اوپر "اعلان" لکھا ہوا تھا۔ عبارت پوری اس طرح تھی:

امرتسر شہر میں 7 مارچ 1947ء دو بجے دن سے دو دن کے لئے چوبیس گھنٹہ کا کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لیے 20 گھنٹے کا کرفیو جس میں 10 بجے سے 2 بجے دن 4 گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔ لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونسپل حدود میں نافذ رہے گا۔ جس شخص کے قبضے میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو پائی گئی یا جو کوئی شخص لوٹتا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اس کو نظر پڑتے ہی گولی مار دی جائے گی۔ ان احکام کو نافذ کرنے کے لیے فوجی دستے دو بجے دن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔

چوبیس گھنٹوں کے لئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید کر دیئے گئے۔ لوگوں نے جلدی جلدی ضرورت کا سامان خریدا اور دو بجے سے پہلے پہلے اپنے گھروں میں دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ ابھی تک گلیوں کو لوہے کے دروازے لگنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ لوگ گلیوں میں بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ کرفیو کی پہلی رات شہر میں مکمل سناٹا طاری رہا۔ صرف کبھی کبھی تھری ناٹ تھری کے فائر کی آواز گونج جاتی تو لوگ سمجھ جاتے کہ کوئی آدمی کرفیو کی خلاف ورزی کرتا ہوا مارا گیا ہے۔

دوسرے روز دو بجے دن کو کرفیو کھلا تو لوگ آزاد ہونے والے قیدیوں کی طرح اپنے اپنے گھروں اور گلی محلوں سے ٹولیوں کی شکل میں باہر نکلنا شروع ہوگئے۔ میں سعید کے گھر

پہنچا اور اسے ساتھ لے کر چوک فرید میں ثریا کے ہاں چلا گیا۔

اس بے چاری کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ چچا کے گھر میں محفوظ تھی۔ کیونکہ چوک فرید سارے کا سارا مسلمانوں کا محلہ تھا اور یہاں کسی کی جرأت نہیں تھی کہ آکر ان پر حملہ آور ہوتا۔ پھر بھی وہ ان ہنگاموں سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے سکول جانا بند کر دیا تھا۔

میں نے اسے اپنے ساتھ شریف پورے لانا چاہا تو اس کے چچا نے اس کی اجازت نہ دی۔ میں زیادہ اصرار نہ کر سکا۔ حالانکہ ثریا میرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ میں واپس آ گیا۔

واپسی پر میوہ منڈی کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک کسی بیوقوف نے ایک بوڑھے سکھ کی پشت میں چاقو سے وار کر کے اسے زمین پر گرا دیا۔ یہ واقعہ ہماری نظروں کے سامنے ہوا۔ حملہ آور آن کی آن میں بھاگ گیا۔ سکھ کے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔ وہ میوہ منڈی سودا وغیرہ خریدنے جا رہا تھا۔ لوگوں نے ایک دم بھاگنا شروع کر دیا۔ وہاں ایک دم پولیس اور فوج کی جیپیں پہنچ گئیں۔ اس کے بعد شہر میں پھر 12 گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دروازہ چاٹی ونڈ کے باہر دو مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

لوگ پھر اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اس دوران میں ہر محلے میں خفیہ اجلاس ہوئے۔ جن میں محلہ کمیٹیاں بنا کر چندہ کر کے گلیوں کو آہنی دروازوں سے بند کرنے کی تجاویز پر غور کیا گیا۔ دوسرے روز کرفیو کھلا تو دھڑا دھڑ لوہے کا سامان آنا شروع ہو گیا اور گلیوں کا منہ دروازوں سے بند کر دیا گیا۔ کڑی آزمائش کی اس گھڑی میں مسلمان ایک دم اکٹھے ہوگئے۔ کیونکہ انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ ہندو سکھوں کے پاس اسلحہ کی بھاری تعداد موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے گھروں میں سوائے حقّوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ ہندوؤں نے سکھوں کے ساتھ مل کر شہر میں اپنے اپنے محلوں میں مسلمانوں کی جائیداد کو آگ لگا کر اکا دکا مسلمانوں کے کنبوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ جن ہندو محلوں میں کافی تعداد میں مسلمان آباد تھے، مثلاً چوک بابا صاحب، ڈھاب کھٹیکاں، کنک منڈی، چوک سفید، کٹڑہ کرم سنگھ وغیرہ وہاں کسی ہندو یا سکھ کی جرأت نہ پڑتی تھی کہ وہ ان پر حملہ آور ہوں۔

فسادات کی یہ آگ قریبی دیہاتوں اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی تھی۔ لیکن ابھی ہر آدمی اپنی اپنی جگہ جم کر بیٹھا ہوا تھا اور ابھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن انہیں اپنے اپنے گھروں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔

لیکن امرتسر کی نسبت باقی تقریباً سبھی شہروں میں فضا اتنی مکدر نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ امرتسر سے بعض کنبے پٹیالہ، نابھ، جالندھر اور گورداس پور وغیرہ میں اپنے اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلے گئے۔ اس خیال سے کہ یہاں امن وامان بحال ہو گا تو واپس آجائیں گے۔ ان میں سے بہت کم کنبوں ---- کو واپس آنا نصیب ہوا۔

امرتسر کا اب یہ عالم تھا کہ اگرچہ بے حد کشیدگی پائی جاتی تھی ہندو سکھ محلوں سے اکا دکا مسلم کنبے ہجرت کر کے مسلمان علاقوں میں آگئے تھے اور اندر ہی اندر دونوں طرف اسلحہ کی زبردست دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی کرفیو کھلتا تو سکھ ہندو ہال بازار میں نکل آتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بازار امرتسر کا مین بازار تھا اور تقریباً ہر بیوپاری، کاروباری، دفتر کے کلرک اور مل مزدور کو اس بازار میں سے گزرنا ہی پڑتا تھا۔

پولیس اور فوج کے زبردست انتظام اور کانگریس اور مسلم لیگ کے اعلیٰ لیڈروں کی آمد اور تقریروں کے بعد شہر میں کسی حد تک امن بحال ہو گیا۔ لڑکیوں کے سکول وغیرہ کھل گئے۔ کاروبار پھر سے شروع ہو گیا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے محلوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود جوالا مکھی کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔ دونوں جانب اسلحہ کی بھاری تعداد جمع ہونے لگی۔

شریف پورے میں چندہ جمع کر کے پشاور کے علاقے سے خفیہ طور پر اسلحہ منگوا لیا گیا۔ اسی طرح گورو بازار کے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اندر ہی اندر باہر سے اسلحہ منگوا کر جمع کرنا شروع کر دیا۔ ہندو پیسے والی قوم تھی اس نے روپے کی مدد سے اعلیٰ سے اعلیٰ اور جدید سے جدید رائفلیں، سٹین گنیں اور دستی بموں کا ذخیرہ جمع کر لیا۔

سکھوں نے بھی اسی قسم کے اسلحہ کی بھاری مقدار سے دربار صاحب کی کوٹھڑیاں بھر لیں۔ ان میں آتش گیر بم بھی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخری وقت پر ہوش آیا تھا اور ہندو سکھوں نے ایک عرصے سے اس جنگ کی تیاری کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ جب پہلے روز اس بات کا خطرہ محسوس کیا گیا کہ قریبی دیہاتوں سے سکھوں کا قافلہ شریف پورے پر حملہ کرنے آرہا ہے اور جب اسلحہ کی پڑتال ہوئی تو اتنی بڑی آبادی میں سوائے چند ایک مرغابیاں مارنے والی بندوقوں کے اور کچھ نہ نکل سکا۔

اب اس تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ ایک بہت بڑے تاجر کو چندہ جمع کر کے دیا گیا کہ غیر علاقے میں جا کر اسلحہ خرید کر لائیں تو وہ صاحب سارے کا سارا چندہ کھا گئے اور افغانستان میں جا کر بس گئے اور ایک صاحب نے اسلحہ کی بھاری تعداد اونے پونے سکھوں کے ہاتھ فروخت کر دی۔ یہ کیا بات ہے کہ جعفر اور صادق مسلمانوں میں ہی پیدا ہوتے رہے ہیں؟ انہی گولیوں نے بعد میں مسلمانوں کے سینے چھلنی کئے۔

ثریا نے اب پھر اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے چھٹی کے بعد اسے اپنے ساتھ لیا اور ہم کرسٹل ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہر کی فضا پر امن تھی مگر کھچاؤ بدستور محسوس ہو رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان ہندوؤں سے ملتے ضرور تھے لیکن دلوں میں جانے کیا کیا پوشیدہ ہوتا تھا۔

کرسٹل کا مالک ہندو تھا۔ وہ بڑا ہنس مکھ تھا۔ ویسے بھی وہ بڑا عیاش آدمی تھا اور کسی مذہب پر ایمان نہ رکھتا تھا اور ہر مذہب کے لوگوں کی عزت کرتا تھا۔ روزانہ رات کو شراب پیتا اور شراب پی کر کبھی اپنے ہوٹل نہ آتا۔ میں جب بھی دوپہر کے وقت ثریا کے ساتھ وہاں گیا اس نے بڑی عزت سے بٹھایا اور بیرے کو خاص ہدایت کی کہ ہمیں کسی چیز کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے خبر تھی کہ ہم ایک دوسرے کے چاہنے والے ہیں اور ایسے لوگ محبت کرنے والوں کی بڑی عزت کیا کرتے ہیں۔

ثریا کو میں نے بتایا کہ میں اس روز اسے خط لکھنے کے لئے چوک گول ہٹی سے پیڈ لینے گیا تھا کہ فسادات کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

"میں تو سکول آتے ہوئے ڈرتی رہتی ہوں۔"

"ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہال بازار میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور سول لائنز کا علاقہ ہے۔ یہاں کبھی اس قسم کی گڑبڑ نہیں ہوئی۔"

"لیکن پھر بھی میرا دل ڈرتا رہتا ہے۔ سوچتی ہوں واپس بٹالے چلی جاؤں۔ امی اور بھائیوں کا بھی یہی خیال ہے۔"

"ارے تم لوگ تو پاگل ہو گئے ہو۔ بھلا پڑھائی ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ فسادات تو کوئی دن کی بات ہے۔ بس ختم ہو جائیں گے۔"

"میرا دل بڑا ڈرتا ہے خالد ---- یوں لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا انقلاب آنے والا ہے۔ آگ اور خون کا سمندر امڈنے والا ہے۔ جیسے چاروں طرف آگ ہی آگ لگ رہی ہو۔"

میں ہنس پڑا۔

"کوئی بات نہیں ہے ثریا۔ یونہی تم پر ان حالیہ حادثات کا اثر ہو گیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم بے فکر ہو کر اپنی پڑھائی جاری رکھو اور اطمینان سے سکول آیا کرو۔ ویسے کل سے میں روزانہ تمہیں سکول چھوڑ جایا کروں گا اور سکول سے واپس گھر تک لے جایا کروں گا۔"

آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہو گی۔"

"ارے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ صبح شام تمہارا دیدار ہو گا۔ تم سے باتیں ہوں گی۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے۔"

ثریا بڑی فکر مندی سی تھی۔ میری تسلیوں کا بھی اس پر زیادہ اثر نہ ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سنگین سی اداسی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ اداسی اس روز بھی اس کی آنکھوں میں تھی جس روز فسادات کے پہلے زبردست ہنگامے کے بعد اس کے ہاں فرید چوک گیا تھا۔ میں نے اس کا جی بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"بھئی یہ قمیض تو بڑی خوبصورت ہے۔"

"کہاں سے لیا تھا کپڑا۔"

ثریا مسکرا کر بولی۔

"آپ کو پسند ہے؟"

"بہت"

"تو پھر لے لیں۔"

"مجھے قمیض نہیں قمیض والی چاہیئے۔"

اور اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اتنے میں بیرا چائے لے آیا۔ اور ہم چائے پینے اور ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ یہ مئی کے آخری دن تھے اور گرمی اپنے شباب پر تھی۔ دوپہر کو انتہائی گرم خشک لوئیں چلتیں اور رات کو مچھر تنگ کرتے۔ ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پینے کے بعد ہم چائے اس خیال سے پی رہے تھے کہ چائے گرمیوں میں ٹھنڈک [illegible] ہے۔

میں اپنے لئے دوسری پیالی بنا کر سگریٹ سلگا رہا تھا کہ اچانک باہر کچھ لوگوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد کچھ لوگ دوڑتے ہوئے ایک طرف کو گزر گئے۔ پھر

ایک طرف سے شور سا بلند ہوا اور ہوا میں اچانک ایک ساتھ چار پانچ فائروں کی آواز گونج اٹھی۔

ثریا کا رنگ زرد ہو گیا اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک "ست سری اکال" کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور پھر فضا میں بندوق کے فائروں کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ شہر میں پھر فساد ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے ثریا سے یہ بات چھپانا ہی مناسب سمجھی۔

"ہائے اللہ! اب کیا ہو گا۔ اب ہم گھر کیسے جائیں گے۔"

"گھبراؤ نہیں یہاں کچھ معمولی گڑبڑ ہو گئی ہو گی۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ گڑبڑ بارہ گھنٹے سے پہلے ٹھیک نہ ہو گی۔ شہر کے جس علاقے میں میں ثریا کے ساتھ بیٹھا تھا وہ اگرچہ سول لائنز کا علاقہ تھا مگر دائیں بائیں جانب سے خالص ہندو سکھ آبادی میں گھرا ہوا تھا۔ میں وہاں سے نکلنے کی تدابیر سوچ ہی رہا تھا کہ فضا میں ایک بار پھر ست سری اکال کے نعروں سے گونج اٹھی اور اس کے بعد پھر ہوائی فائر ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی ہمارے کیبن پر کسی نے دستک دی۔ ثریا مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کا دل دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو گئے۔ اب مجھے بھی فکر لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے مرتے دم تک ثریا کی حفاظت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"کون ہے؟"

میں نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں مہاراج! ذرا بہن جی سے کہیں کہ پردہ کر لیں۔"

یہ ہوٹل کے ہندو مالک کی آواز تھی۔ میں نے ثریا سے نقاب الٹنے کو کہا اور ہوٹل کے ہندو مالک کو، جس کا نام بالک رام تھا، اندر بلا لیا۔ بھاری جسم کا چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا سانولا سا بالک رام اندر آ گیا۔ اس نے بوسکی کی قمیض اور کالی دھاری دار ریشمی دھوتی کے ساتھ سیاہ پمپ شو پہنا ہوا تھا۔ کلائی پر سونے کی زنجیر والی گھڑی تھی اور ماتھے پر ایک طرف سبز رنگ کا چاند کھدا ہوا تھا۔

"بالک رام صاحب یہ باہر کیا بات ہوئی ہے۔"

بالک رام کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بات یہ ہے مہاراج! ابھی ابھی پتلی گھر میں دو آدمی قتل ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں ان میں

ایک ہندو اور ایک مسلمان تھا۔ اس کی خبر یہاں پہنچی تو یہاں بھی بلوہ ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں یہاں کی ساری آبادی غیر مسلمانوں کی ہے۔ انہوں نے اس کے جواب میں ہسپتال سے باہر نکلتے ہوئے دو مسلمانوں کو چھرا گھونپ کر مار دیا ہے۔ اب میں آپ سے یہ کہنے آیا تھا کہ آپ فکر نہ کریں اور بڑے آرام سے یہاں بیٹھے رہیں۔ یہاں آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

ثریا نے گھبرا کر کہا:

"کیا ہم گھر نہیں پہنچ سکتے؟"

"شہر کی فضا ٹھیک نہیں بہن جی! آپ ذرا دیر ٹھہریں میری موٹر ابھی آ جائے گی میں خود آپ کو شہر چھوڑ آؤں گا۔ اچھا اب آرام سے چائے پئیں۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ ثریا کا مارے پریشانی کے برا حال ہو رہا تھا اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے اس کو ٹھنڈا اسکویش منگوا کر پلایا۔ جب کہیں جا کر اس کی جان میں تھوڑی سی جان آئی۔

اتنے میں پھر شور مچا اور لوگوں کے ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ بالک رام بھاگتا ہوا کیبن میں آیا اور بولا:

"آپ پچھلے کمرے میں چلے جائیں۔ جلدی کریں۔"

ہم دونوں جلدی سے اٹھے اور بالک رام کے ساتھ ہوٹل کے عقب میں سب سے پچھلی کوٹھڑی میں جا کر چھپ گئے۔

"بالکل خاموش بیٹھے رہیں۔"

وہ باہر جا کر ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا۔ ثریا کا برا حال ہو رہا تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کوٹھڑی میں سوڈا واٹر کی مشین تھی اور خالی بوتلوں اور لکڑی کے ڈبوں کا انبار لگا تھا۔

"یا اللہ اب کیا ہو گا۔ خالد مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ میں مر گئی تو مجھے اپنے ہاتھوں سے دفن کرنا۔ میری لاش کو بچا لے---------

"خدا کے لئے خاموش رہو---------"

میں روشندان میں سے اوپر چڑھ کر باہر جھانک رہا تھا۔ بالک رام نے باہر کوٹھڑی پر تالا ڈال دیا تھا اور خود کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔ اتنے میں سکھوں اور ہندوؤں کا ایک ہجوم

جنہوں نے ہاتھوں میں تلواریں اور بلمیں اور بندوقیں اٹھا رکھی تھیں، دکان پر آ کر چڑھ گیا۔ ایک نیلی پگڑی والے سکھ نے کیبن کا پردہ کھینچ کر دیکھا۔

"کیوں بالکے یہاں کوئی مسلا تو نہیں چھپا ہوا۔"

بالک رام کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے آثار تھے۔ مگر اس نے مسکراتے ہوئے بڑی گرجدار آواز میں کہا:

"ہرنامو! مسلا یہاں ہوتا تو کبھی کا ٹھکانے لگا دیا ہوتا۔ تم ہمیں کیا سمجھتے ہو۔ چاقو مارنا تو بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

کچھ لوگ ہنس پڑے۔

"بلے بھئی بالکیا تیرے---------"

اس کے بعد سب لوگ دکان پر سے اتر کر نعرے لگاتے آگے چل دیئے۔ ہماری اور بالک رام کی جان میں جان آئی۔ آگے مجیٹھ روڈ پر مسلمانوں کی کوٹھیاں تھیں۔ شاید یہ لوگ اب اس طرف گئے تھے۔ میں روشندان سے نیچے اتر آیا۔

نیچے ثریا آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھ جوڑے آیت الکرسی پڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔ بالک رام نے جلدی سے آ کر کوٹھڑی کا تالا کھولا اور ہمیں تسلی دی کہ وہ لوگ آگے چلے گئے ہیں۔

"لیکن اب آپ لوگوں کا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ اگر کسی نے مخبری کر دی تو یہ لوگ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کو شہر کیسے پہنچایا جائے۔ بہن جی نے برقع اوڑھ رکھا ہے۔ برقع اتار بھی دیا تو کسی کو شک پڑ گیا تو آپ کا بچ نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"میں نے دو تین بار گھر گاڑی کے لئے فون کیا ہے۔ مگر کوئی جواب نہیں آ رہا۔ شاید فون خراب ہو گیا ہے۔ گاڑی آ جائے تو میں آپ کو ابھی چھوڑ آؤں۔ اول تو یہاں تانگہ ایک بھی نہیں اگر کوئی مل بھی جائے تو تانگے پر یہ علاقہ عبور کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ وہ ہر سواری کو چوک میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ آپ گھبرائیں بالکل نہیں۔ میں اندر پنکھا بھجوائے دیتا ہوں۔ اس دوران میں گاڑی کا بندوبست کرتا ہوں"

بالک رام نے اندر ٹیبل فین اور دو کرسیاں بھجوادیں اور خود بار بار فون کرنے لگا۔
اتنے میں فوج کی لاریاں اور جیپیں شور مچاتی دھڑا دھڑ وہاں سے گزرنے لگیں اور کرفیو کا اعلان کردیا گیا۔ میں نے سر پکڑ لیا۔

"یہ لو کرفیو لگ گیا۔ اب رات یہیں گزرے گی۔"

ثریا رونے لگی۔

"یا اللہ اب کیا ہوگا۔ گھر والے کیا کہیں گے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ جب مصیبت پڑتی ہے تو اسے سہنا ہی ہوگا۔"

"مجھے اس آدمی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ کہیں ہمیں قتل نہ کروا دے۔ ہائے میں تو مر جاؤں گی۔"

"فکر نہ کرو------ بالک رام نیک آدمی ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔"

میں نے روشندان کے سوراخ میں سے دیکھا۔ بالک رام نوکروں کے ساتھ مل کر جلدی جلدی ہوٹل کے دروازے بند کروا رہا تھا۔ پھر وہ بھاگتا ہوا اندر آیا۔"

"اب ہم میں سے کوئی یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ صبح نو بجے تک کرفیو لگ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ رات یہیں بسر ہوگی۔"

بالک رام ہنس پڑا:

"میں کیا کہہ سکتا ہوں ماراج! آپ کے ساتھ میں بھی یہیں رہوں گا۔ آپ جانتے ہیں کرفیو میں کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ گورے گولی پہلے مارتے ہیں اور آواز بعد میں دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں گنک منڈی میں انہوں نے ایک ایسے آدمی کو گولی مار دی جس کی جیب میں کرفیو پاس تھا۔ کرفیو پاس انہوں نے اس کی چھاتی پر رکھ دیا اور خود چلے گئے۔ یہ تو پورے حرامی ہیں ماراج پورے حرامی! خیر آپ فکر نہ کریں۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ اب آپ بالکل محفوظ ہیں۔ یہاں صبح تک اب کوئی نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن بالک رام جی یہاں رات کیسے بسر ہوگی؟"

بالک رام نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"اس کا بندوبست ہوجائے گا ماراج۔ ایسا کریں گے ناں۔ کیبن میں بہن جی کو بستر لگا

دیں گے۔ باقی ہم یہاں بڑے کمرے میں بستر لگا کر سو جائیں گے۔"

اور یہی ہوا۔ بالک رام شام تک بڑے کمرے میں کاؤنٹر کے پاس پنکھا چھوڑ کر بیٹھا دو تین ملازموں کے ساتھ ہوٹل کا حساب کرتا رہا اور میں اور ثریا کیبن میں بیٹھے کبھی سکویش اور کبھی چائے پیتے رہے۔ ثریا کا یہ سوچ کر برا حال ہو رہا تھا کہ گھر والے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ وہ تو اپنی طرف سے یہ سمجھ رہے ہوں گے ثریا ماردی گئی ہے یا اغوا کرلی گئی ہے۔

"اب ہم انہیں کس طرح خیریت کا پیغام بھجوائیں۔ ظاہر ہے حقیقت حال کا علم تو انہیں کل صبح ہی ہوگا۔"

ثریا حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ سکول سے باہر نکلی تھی۔ اگر وہ اسی وقت گھر چلی جاتی تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن مجھ سے ملنا بھی ضروری تھا۔ اب اس قسم کی سوچ بچار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اسے ہر حالت میں آج کی رات اس ہوٹل میں بسر کرنی تھی۔ میں نے کہا:

"اگر میں بھی کیبن میں سو جاؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"خدا کے لئے اس وقت مجھ سے ہنسی مذاق نہ کریں۔ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم صبح میں زندہ بھی اٹھوں گی یا نہیں؟"

شام کو بالک رام نے ہمارے لیے آلوؤں کے کٹلس بنوائے اور ساتھ پوری ڈبل روٹی اور مکھن رکھ دیا۔ ثریا کو تو بالکل بھوک نہیں تھی پھر بھی میں نے زبردستی اسے تھوڑا بہت کھلا دیا۔ رات کو ثریا کا بستر یعنی ایک پرانا گدا اس پر پردوں کی چادر اور صوفوں کی گدیاں کیبن میں لگا دیں۔ میں اور بالک رام کیبن کے باہر ہوٹل کے بڑے کمرے کے درمیانی راستے میں دو دو میزیں جوڑ کر لیٹ گئے۔ رات بھر ثریا کے کروٹیں بدلنے اور باہر ست سری اکال کے نعروں کی آوازیں آتی رہیں۔ کسی وقت ہسپتال کے پار شریف پورے کی جانب سے "اللہ اکبر" اور "یا علی" کے نعروں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتیں۔

بالک رام دونوں کے نعرے سن کر سر کھجا کر بولا:

"میری سمجھ میں یہ دونوں نعرے نہیں آتے۔ میں تو کہتا ہوں آدمی کو نعرہ لگانا ہی نہیں چاہیئے۔ دیکھئے اب ان نعروں نے شہر کا کیا حال کر دیا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ مسلمان بھائی اپنا مسجدوں میں نماز پڑھیں، ہندو مندروں میں عبادت کریں اور سکھ گوردواروں میں کیرتن کریں۔ لیکن یہ ساری آگ انگریز کی لگائی ہوئی ہے۔ اس میں ہم لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ یقین کریں میں کبھی مندر نہیں گیا۔ کبھی ماتھا نہیں ٹیکا۔ کبھی سرن نہیں کیا۔ پھر بھی میں بڑا خوش ہوں۔ میں روز رات کو شراب پیتا ہوں اور اپنے بچوں میں بیٹھ کر پیتا ہوں۔ جانتا ہوں شراب بری شے ہے پر ماراج کیا کروں۔ عادت ایسی پڑ گئی ہے کہ جب تک اسے نہ پی لوں چین نہیں آتا۔ آپ شراب پیتے ہیں؟" نہیں؟ بالکل نہ پیئں خواہ کچھ ہو۔ شراب بری شے ہے۔ میرا خیال ہے بہن جی کو نیند آ گئی ہے۔ اب دیکھئے ناں کیسی کیسی شریف بہنیں بے چاری کس طرح پریشان ہیں۔ یہ سب کیا دھرا ان نعرہ بازیوں کا ہے۔ ابھی بھگوان جانے کیا ہونے والا ہے۔ آپ کو نیند آ رہی ہے تو بے شک سو جائیں۔ سگریٹ لیجیئے۔"-----

میں نے سگریٹ سلگایا۔ بالک رام پلیئرز کے سگریٹ پیتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر ایک دم سو گیا۔ اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ چھت کے دونوں پنکھے پورے زور شور کے ساتھ چل رہے تھے۔ کمپنی باغ کی طرف سے کبھی کبھی کسی پرندے کے اچانک چیخنے کی آواز آ جاتی۔ فضا میں کبھی کبھی افسروں کی آواز بلند ہوتی اور کبھی کبھی رائفل کی گولیوں کی سنسناہٹ سنائی دے جاتی۔

میں نے آہستہ سے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔

ثریا دوسری طرف منہ کئے سو رہی تھی۔ پاس ہی صوفے پر اس کا نسواری برقع اور اسکول کی کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے پردہ گرا دیا۔ اور اپنی میز پر آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دیوار پر لگی ہوئی بڑی گھڑی رات کے پونے بارہ بجا رہی تھی۔ میں میز پر لیٹا سگریٹ پھونکتا رہا۔ کمرے کی صرف ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی۔ میں اسی طرح کوئی دو بجے تک جاگتا رہا۔ قریباً ڈھائی بجے مجھے نیند آ گئی۔

اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ بالک رام ابھی تک سو ر

تھا۔ اندر ثریا بھی گہری نیند میں غافل پڑی تھی۔ اسے بالکل ہوش نہیں تھا۔ کہ وہ گھر میں ہے یا کسی ہوٹل کے کیبن میں بے کسی کے عالم میں سو رہی ہے۔

پورے نو بجے کرفیو ٹوٹا تو بالک رام کی موٹر باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہمیں گاڑی میں سوار کرایا اور خود گاڑی چلاتا ہوا شہر کی طرف چل پڑا۔ مسجد خیر دین کے دوسرے چوک میں ہم اتر گئے۔

بالک رام نے ثریا کو ہاتھ جوڑ کر کہا:——"بہن جی! میں خاطر نہیں کر سکا۔ تکلیف معاف کر دیں۔ اچھا ماراج نمستے!"

"نمستے!"

میں نے ہاتھ جوڑ کر بالک رام کو پرنام کیا۔ رام نام کو پرنام کیا، رام راج کو پرنام کیا۔ اندھیروں میں ٹمٹماتے ہوئے اکیلے دیئے کو پرنام کیا۔ اور ثریا کو ساتھ لے کر اس کے گھر آ گیا۔

وہ لوگ ثریا کو مار بیٹھے تھے۔ ثریا کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ جب میں نے ساری کہانی سنائی تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ثریا چچی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں چپکے سے نیچے اتر آیا۔ چوک فرید میں مسلمان نوجوان بڑے جوش کے عالم میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہندو محلے کی جانب جانے والا بازار ویران پڑا تھا۔ جہاں ہندوؤں کے گھر شروع ہوتے تھے وہاں دو تین گڈے الٹا کر مورچہ سا بنا دیا گیا تھا۔ غیر مسلموں کے محلوں کی طرف کھلنے والی گلیوں کے منہ آہنی مضبوط دروازوں سے بند کر دیئے گئے تھے۔ کرفیو کھل گیا تھا۔ ہال بازار میں لوگوں کا ہجوم ادھر سے ادھر آ جا رہا تھا۔

پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی۔

لوگوں کے ہجوم میں سکھ بہت ہی کم تھے۔ عورت کا کہیں نشان تک نہ مل رہا تھا۔ رام باغ میں بھی یہی حال تھا۔ طوائفوں نے اپنے کوٹھے مستقل طور پر بند کر دیئے تھے اور خدا جانے وہ کہاں چلی گئی تھیں۔ میں یہاں سے ہوتا ہوا اپنے گھر شریف پورے آ گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو والدہ والد اور بہن بھائیوں نے خوشی کی چیخ پکار مچا دی۔ ہر کوئی گلے لگاتا اور بار بار منہ چومتا۔ فسادات کے دنوں میں جو آدمی رات کو گھر نہ آئے اس کے متعلق یقین کر لیتے تھے کہ وہ مار دیا گیا ہے۔ میرا صبح پھر گھر آ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ یار دوستوں

نے بھی میری واپسی کی بڑی خوشی منائی۔ محلے میں ہر طرف بڑی سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ رات بھر جنڈیالہ کی طرف سے سکھوں کے جتھے کی آمد کی افواہ گرم رہی۔ وہ سب لوگ حفاظتی چوکیوں پر چوکس رہے مگر کوئی جتھہ نہ آیا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ کمپنی باغ میں کل تین مسلمان مالیوں کو شہید کر دیا گیا۔ اب وہ پروگرام بنا رہے تھے کہ شام کو جو سکھ مزدور ورکشاپوں سے واپس آتے ہوئے جی ٹی روڈ پر سے گزریں تو ان سے کمپنی باغ کے مالیوں کا بدلہ لیا جائے۔

میں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کا بدلہ لینا ہے تو پھر بالک رام کے احسان کا بھی جواب دیا جائے۔

میرے کچھ دوست تو میرے قائل ہو گئے اور انہوں نے قتل اور خون کے کھیل سے ہاتھ اٹھا لیئے۔ لیکن دوسرے لوگ بالکل نہ مانے بلکہ الٹا مجھے غدار اور ہندوؤں کا ایجنٹ کہنے لگے۔

چنانچہ انہوں نے مالیوں کا بدلہ لے ہی لیا۔ گرچہ سکھوں نے شریف پورے کے سامنے سے گزرنا بند کر دیا تھا۔ کیونکہ شریف پورے کا بڑا خوف ان لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بات ہندو سکھو میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی کہ شریف پورے میں زبردست اسلحے کے ذخیرے موجود ہیں۔ ویسے بھی شریف پورے کے نوجوان لڑکے بہادری اور جی داری میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

پھر بھی اس روز دو سکھ مزدور بدقسمتی سے اس سڑک پر نکل آئے۔ بس پھر وہ اس رات اپنے بال بچوں کے پاس گھر نہ پہنچ سکے۔ پھر وہ کسی رات گھر نہ پہنچ سکے۔ کیا ان کی ماں بہنیں کمپنی باغ کے مسلمان مالیوں کی طرح آج بھی ان کا انتظار کر رہی ہوں گی۔

اب کبھی ملاقات نہ ہو گی۔ اب زندگی بھر درشن نہ ہوں گے۔ روشن چراغ گل ہو گئے۔ مسجدوں کے صحن اجڑ گئے۔ مندروں کی گھنٹیوں کو زنگ لگ گیا۔ لوگ بہرے اور گونگے ہو گئے۔ ستاروں سے خون ٹپکنے لگا۔ اب ہمیشہ کے لئے الوداع! ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے رخصت! میری بہن رضیہ! میری بہن پرکاش کور! میرے بھائی غلام علی اور اقبال سنگھ--!

الوداع سب بھائیو! سب بہنو!،

اب یہ حالت ہو گئی کہ کرفیو لگتا تو لوگ چھپ چھپ کر دوسرے فرقوں کے خا

چھوڑے ہوئے مکانوں میں آگ لگا دیتے۔ صبح کرفیوں کھلتا تو کہیں نہ کہیں جہاں موقع ملتا اکا دکا قتل اور چھرا گھونپنے کی وارداتیں ہو جاتیں۔

شریف پورے والوں نے تحصیل پورے والے ہندو سکھو کے سب مکان لوٹ لیے۔ صرف انہیں آگ لگانا باقی تھا۔ سو ایک ایک کر کے ان میں سے چھ سات مکان جلا دیئے گئے۔ پھر جب اس طرف فوج کی پکٹ بیٹھ گئی تو تحصیل پورے میں آتشزدگی کی وارداتیں بند ہو گیئں۔ شریف پورے کے باہر شراب کا ٹھیکہ ہوا کرتا تھا۔ ایک روز وہ بھی لوٹ لیا گیا۔ لوٹ مار کے رسیا نوجوان شراب کی بوتلیں اٹھا کر شریف پورے میں لے آئے۔ رانی بازار کے نصرو اور بدمعاش کو تحصیل پورے کے مکان سے کسی سکھ کی خاکی وردی اور بندوق مل گئی تھی۔ ناٹے قد کا نصرو خاکی وردی ڈٹھائے کندھے پر بندوق رکھے اور گلے میں کارتوسوں کی پیٹی سجائے لوٹی ہوئی شراب کی بوتل چڑھا کر شریف پورے کے بازاروں میں ڈولتا پھرتا۔

راتیں بڑی وحشتناک ہو گئی تھیں۔ امرتسر کا حلیہ بدل گیا تھا۔ باغ ویران ہو کر اجڑ گئے تھے۔ درختوں پر پھل آ گئے تھے مگر انہیں اتارنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ انہی ٹہنیوں پر لگے لگے ہی گل سڑ رہے تھے۔ نہریں اسی طرح پانی کے ننھے منے گرداب بناتے بہہ رہی تھیں۔ مگر وہاں کوئی نہانے والا نہیں تھا۔

دربار صاحب کو جانے والی ہنسلی کے پار والا مندر سنسان ہو گیا تھا۔ اور پجاری کہیں بھاگ گئے تھے۔ کیونکہ یہ سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر اثر تھا۔ یہی حال غیر مسلموں کے محلوں میں مسجدوں کا تھا۔ ان مسجدوں میں ہندو سکھوں نے اسلحہ چھپا کر رکھا تھا اور وہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ ان خطرناک حالات میں بھی کچھ لوگوں نے امن کمیٹیاں بنانا شروع کر دیں۔ مگر یہ کمیٹیاں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

امرتسر میں ایک بڑے مشہور سوشل کارکن ہوا کرتے تھے۔ آپ ایک روز کرفیو کے کھلنے پر ہندوؤں کی ایک گنجان آبادی میں امن کی تبلیغ کرنے گئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ وہ ایک دکان کے پھٹے پر کھڑے امن کی تبلیغ کر رہے تھے کہ ایک چوبارے سے سنسناتی ہوئی گولی آئی اور ان کے سینے سے پار ہو گئی۔ یہ امن کا شیدائی وہیں لڑکھڑا کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔

اب ہندوؤں کے محلوں کے مسلمان پوری طرح ہجرت کر کے مسلم اکثریت کے محلوں میں آ گئے تھے۔ اسی طرح غیر مسلم مسلمان محلوں سے نکل گئے تھے۔ اب کوئی ہندو کرفیو کے بعد بھی مسلموں کے علاقے میں نہیں جاتا تھا۔ صرف ہال بازار میں جو ایک مشترک بازار تھا اور جہاں پولیس کی بھاری جمعیت ہر وقت گشت لگایا کرتی ہندو سکھ اور مسلمان کرفیو کھلنے کے بعد اکٹھے دیکھے جاتے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے بالکل بات نہ کرتے۔ ہر آدمی دوسرے سے خوف کھانے لگا تھا۔ دوست کو دوست پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ لڑکیوں کے سب سکول بند ہو گئے تھے۔

ثریا کی والدہ بٹالے سے آ کر ثریا کو اپنے ساتھ بٹالے لے گئی تھی، بٹالے میں ابھی تک کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ مگر امرتسر میں قتل و غارت کی خبریں ان علاقوں کی فضا کو بھی زہر آلود کر رہی تھیں۔ ثریا کو ہم سب چھوڑنے سٹیشن تک گئے۔ وہ بڑی اداس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تو اس نے گھری گھری پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا"۔

"اس روز تم بٹالے جانے کو بے تاب ہو رہی تھیں"۔

"ہاں --- لیکن آج یہاں سے جاتے ہوئے دل گھبرا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پھر یہاں کبھی نہ آ سکوں گی۔ پھر آپ کو کبھی نہ دیکھ سکوں گی اگر --- اگر ایسا ہو گیا خالد تو مجھے بھلا نہیں دینا آپ شاید مجھے یاد نہ رکھیں مگر میں مرنے کے بعد بھی۔"

"ہش --- ایسی باتیں نہیں کرو ثریا۔ یہ فسادات کوئی دن کی بات ہے۔ پھر ہم سب مل جائیں گے۔ یاد نہیں، ابھی ہمیں شادی کرنی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں۔ اس دوران میں تم بے شک اپنی امی سے منگنی کی بات کر دینا"۔

ثریا نے اس کا جواب دینے کی بجائے بڑی حسرت آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا اور گاڑی چل پڑی۔ ثریا کی آنکھوں میں ایک التجا تھی کہ اسے روک لیا جائے۔ مگر وہ تو یونہی گھبرا رہی تھی۔

گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی اور ثریا کی شکل میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

امرتسر کی گڑبڑ کا سن کر مسعودہ بھی اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آ گئی تھی۔ جب حالات تھوڑے سے ٹھیک ہو گئے تو پھر واپس چلی گئی۔

ایک روز رات کو ہم اپنے محلے کے کوٹھوں پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے کہ اچانک جالندھر ریلوے لائن کی طرف سے کچھ لوگوں کے سر اندھیرے میں ہلتے اور شریف پورے کی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ ابھی ہم انہیں اچھی طرح پہچان بھی نہیں سکے تھے کہ "ست سری اکال" کا نعرہ بلند ہوا اور ہمارے مکانوں پر گولیوں کی بوچھاڑ برسنے لگی۔ سارے شریف پورے میں شور مچ گیا۔ لوگ نیزے بندوقیں اور تلواریں لے کر باہر نکل آئے۔ دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ اندھیرے میں ریلوے لائن پر دو بدو مقابلہ بھی ہوا یہ سکھوں کا ایک جتھہ تھا جو قریبی دیہات سے شریف پورے پر حملہ کرنے کے لیئے آیا تھا۔ شریف پورے والوں کو زیر کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔

چنانچہ بری طرح مار کھا کر یہ جتھہ وہاں سے بھاگ گیا۔ واپس بھاگتے ہوئے وہ چار سکھوں کی لاشیں چھوڑ گئے۔ ایک مسلمان مارا گیا۔ یہ ایک کوچوان تھا۔ جو ہر مورچے پر سب سے آگے ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے پولیس والوں سے بچنے کے لئے، جو ہمیشہ مسلمانوں ہی کو مورد الزام بناتے تھے، ان لاشوں کو گڑھے کھود کر سامنے والے امرود کے باغ میں دفن کر دیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد وہاں فوج آ پہنچی اور اس نے یونہی ہوا میں فائر کرنے شروع کر دیئے۔ شریف پورے والے سب اپنے محلوں میں آ گئے۔ اور یوں سناٹا طاری ہو گیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

محلے کی ٹولیاں بم بنانے کے نسخوں پر غور کرنے لگیں۔ حسن دین حبشی نے کہا:

"میرے پاس آتش گیر بم کا ایک نایاب نسخہ ہے"۔

"وہ کیا؟"

شمے ٹپ گر نے پوچھا۔

"بس خواجہ اکسیر ہے اکسیر --- سگریٹ کے ڈبے میں پٹرول بھر کر ربڑ ---"

"ارے چھوڑو ---- یہ کونسا انوکھا نسخہ ہے۔ ایسے بم تو میں دن میں ہزار بنا لوں"۔

"تو پھر ایک اور بم کا نسخہ سنو۔ بس بم کیا جلیبی ہو گی جلیبی۔ دشمن کے گھر میں جا کر پاگل کتے کی طرح چاروں طرف بھونکنا اور اودھم مچانا شروع کر دے گا۔ بس دو حرفی بات ہے۔ بھینس کا سینگ لے کر اس میں گندھک پوٹاش بھر دو اور جہاں چار سکھ دیکھو وہیں آگ لگا کر چھوڑ دو"۔

"بس خواجہ اپنی کیمیا گری رہنے دو۔ پہلے ایک بھینس ذبح کریں اور پھر کہیں جا کر دو بم بنائیں۔"

کٹڑہ مان سنگھ سے جو سڑک شریف پورے کی طرف آتی تھی اس کی بائیں جانب سکھوں کا ایک بہت بڑا قلعہ تھا، جس کا نام برج پھولا سنگھ تھا۔ اس قلعے کی تعمیر سکندر حیات مرحوم کے عہد وزارت میں ہوئی۔ مسلمانوں نے اس زمانے میں بڑا شور مچایا مگر جانے کیوں یہ قلعہ پھر بھی تعمیر ہو کر ہی رہا۔

اس قلعے میں سکھوں نے اسلحے کا بڑا بھاری ذخیرہ چھپا رکھا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ ساری ساری رات شریف پورے اور دروازہ مان سنگھ اور گھی منڈی کے دروازے والے مسلمانوں کے گھروں پر گولیاں چلاتے رہتے تھے۔ اگرچہ ان دونوں دروازوں کے باہر فوج کی چوکیاں تھیں۔ مگر ان دنوں کچھ دور ہی ایسا تھا کہ فوج بھی اس بک بک سے تنگ آگئی تھی اور وہ کوئی آخری فیصلہ چاہتی تھی۔ یعنی یا تو انہیں کہا جائے کہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ اور یا حکم دے دیا جائے کہ ان لوگوں کو دس منٹ کے اندر اندر شہر سے باہر نکال دو۔

(چنانچہ جب پاکستان بن گیا اور امرتسر بھارت کا ایک حصہ ہو گیا تو ہندو فوج نے یہی کچھ کیا)

اس لئے وہ ان گولیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ صبح اگر انہیں کوئی لاش یہاں وہاں مل جاتی تو وہ اسے پٹرول چھڑک کر جلا ڈالتے۔

اس کے باوجود مسلمان فوجیوں کو مسلمان محلوں کے بچاؤ کا بڑا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے جس طرح اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر امرتسر کے مسلمانوں کی مدد کی ہے ان کی یاد ان لوگوں کے سینوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی اور بلوچ فوج کی بہادری، محبت اور ایثار کیشی کے قصے ان لوگوں کے گھروں میں نسل در نسل یاد رکھے جائیں گے۔

ایک روز کیا ہوا کہ کٹڑہ مان سنگھ سے دو مسلمان برقع پوش عورتیں تانگے میں سوار ہو کر دروازے سے نکلیں اور شریف پورے کی طرف چل پڑیں۔ کرفیو کھلے کوئی آدھ گھنٹہ ہوا تھا۔ مگر فضا زیادہ مخدوش ہونے باعث ان سڑکوں پر کوئی آدمی نہیں چل رہا تھا۔ ابھی یہ تانگہ دروازے سے نکل کر شریف پورے والی سڑک پر آیا ہی تھا کہ برج پھولا سنگھ کی طرف سے دو

اکالی نہنگ گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے اس تانگے کی طرف آئے اور انہوں نے آتے ہی مسلمان کوچوان کو تلوار کا بھرپور وار کر کے شہید کر دیا اور عورتوں کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔

ان عورتوں نے چیخ پکار مچا دی۔ ان کی آوازیں سن کر شریف پورے سے دو جوان تلواریں ہاتھ میں لیے ان کی مدد کو دوڑے۔ اس اثنا میں ان نہنگوں نے ایک ایک عورت کو کندھے پر ڈال کر قلعے کی سمت بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ شریف پورے کے نوجوانوں نے انہیں سڑک اور قلعے کے عین درمیان جالیا۔ ایک نے جاتے ہی ایک نہنگ کی ٹانگوں میں تلوار کا پورا ہاتھ مارا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ لڑکھڑا کر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ دوسرا نہنگ عورت کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

مسلمان جوانوں نے نیم بے ہوش عورتوں کو جلدی سے اٹھایا اور سڑک پر آگئے۔ اب قلعے کی جانب سے گولیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ ان لڑکوں نے عورتوں کو تانگے میں ڈال کر اسے سرپٹ دوڑا کر شریف پورے کے دروازے پر آ کر دم لیا۔ اس واقعے نے برج والے سکھوں کو مشتعل کر دیا اور انہوں نے اسی دن شام کو دروازہ مان سنگھ اور گھی منڈی کے درمیان والی مکانوں کی قطار میں ایک جگہ جتھہ بنا کر حملہ کر دیا۔ یہ مسلمانوں کے مکان تھے اور ان مکانوں کے دروازے بالکل بند تھے ---------------

--------------- لوگ چھتوں پر چڑھ گئے۔ ان لوگوں کے پاس صرف چند بندوقیں ہی تھیں۔ ادھر حملے کی خبر کٹڑہ مان سنگھ والوں کو ملی تو وہ اپنے بھائیوں کی مدد کو نعرے لگاتے اٹھ دوڑے، عورتوں نے کھڑکیوں میں سے کانپتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ اپنے بھائیوں، بیٹوں اور خاوندوں کو "میدان جنگ" کی طرف جاتے دیکھا اور دل پر ہاتھ رکھ کر رہ گئیں۔

دروازے کے باہر زبردست لڑائی شروع ہو گئی۔ ایک مسلمان گھسنے لگا۔ اوپر مسلمان عورتوں نے کہرام مچا دیا۔ ایک منچلے لڑکے نے نیچے سے نیزے کا بھرپور ہاتھ مارا اور وہ نہنگ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اتنے میں فوج کی جیپ دور سے آتی ہوئی دکھائی دی دونوں طرف کے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ فوج نے آ کر لاشوں پر قبضہ جما لیا اور انہیں باہر لے جا کر

خدا جانے جلا دیا یا نہر میں بہا دیا۔

کٹڑہ جے مل سنگھ میں ایک بوڑھا سکھ بیمار ہو گیا۔ فسادات کی دہشت سے اس کی زبان بند ہو گئی اور فالج نے اسے ادھ موا کر دیا۔

نیم والی گلی کا ایک مسلمان جو اس سکھ کا بچپن کا یار تھا اس کی خبر لینے چل پڑا۔ جب وہ سکھوں کی گلی میں پہنچا تو اپنے بیمار دوست کے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے اسے کرپانیں مار کر شہید کر دیا۔

سعید کی گلی سے ایک سکھ فسادات سے پہلے روزانہ صبح کو گزرا کرتا تھا۔ جب وہ گلی والی سفید مسجد کے سامنے گزرنے لگا تو ہاتھ جوڑ کر مسجد کو پرنام کیا کرتا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو سعید نے بتایا کہ اس سکھ کی لاش اسی مسجد کے باہر نالی میں پڑی تھی اور اس کی پشت پر تلوار کا ایک فٹ لمبا اور پانچ انچ گہرا زخم تھا جو نیلا پڑ گیا تھا۔ کسی سر پھرے ناسمجھ نے اس نیک دل بوڑھے کو ہلاک کر دیا تھا۔

لیکن ایسا ہر جگہ ہوا ہے۔ جب جنگل میں آگ لگ جائے تو خشک درختوں کے ساتھ تر و تازہ پھول بھی جل جایا کرتے ہیں۔

آگ نے آدھے امرتسر کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

فضا میں ہر وقت گندہ بیروزہ، مٹی کے تیل اور جلی ہوئی لکڑیوں کی کڑوی بو پھیلی رہتی۔ مکانوں کی چھتوں پر جلتے مکانوں کی راکھ اڑاڑ کر آتی اور بجھ جاتی۔ مکان جلانا اور انسانوں کو مار ڈالنا ایک بڑی معمولی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ کٹڑہ جے مل سنگھ کی تمام عمارتیں جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔ کرفیو کھلنے کے بعد میں نے ایک روز وہاں جا کر دیکھا کہ ایک مکان کا سارا اگلا حصہ جل کر ڈھے گیا ہے۔ پچھلے حصے کی دیوار اوپر تک سلامت ہے اور تیسری منزل پر نلکے کے نل کے ساتھ لوہے کی زنجیر سے بندھی ہوئی ایک بکری کی بھنی ہوئی لاش لٹک رہی ہے۔ اسی جگہ ملبے میں ایک عورت کا جلا ہوا ہاتھ بھی نظر آیا۔ میں واپس آ گیا۔ مجھ سے انسانی بہیمیت اور بربریت کے یہ سرخ دھبے دیکھے نہ گئے۔

مگر اس کا کیا علاج تھا کہ انسان کو انسان کا خون لگ چکا تھا اور وہ بورایا ہوا پھر رہا تھا۔

جولائی کے دن تھے بارشیں شروع ہو چکی تھیں کہ ایک روز جمعہ پڑھنے کے لئے مسلمان پراگ داس والے چوک کی مسجد میں جمع ہوئے۔ وہ بڑی نیک دلی کے ساتھ نماز پڑھنے گئے تھے کہ عین نماز کے دوران کسی نے وہاں بم پھینک دیا۔ دو مسلمان اسی وقت شہید ہو گئے۔ اس کے بعد سکھوں نے غیر مسلم پولیس والوں کی مدد سے نہتے مسلمانوں پر مسجد میں گھس کر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے پاس سوائے وضو کرنے والے لوٹو اور مٹی کے ڈھیلوں کے اور کچھ نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ہجوم مومنین میں سے بہت کم جان بچا کر اپنے اپنے محلوں میں آ سکے۔ شہید مسلمانوں کی لاشوں کو مسجد سمیت جلا دیا گیا۔

اس اندوہناک واقعے نے شہر میں آگ لگا دی۔ مسلمانوں نے جوش انتقام میں آ کر جوابی کاروائی کے طور پر سکھوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اب دونوں طرف سے حملے تیز ہوتے گئے۔ امرتسر ویران ہو گیا۔ سول لائنز کے علاقے کے لوگ کوٹھیوں پر تالے لگا کر شہر کے اندر آہنی دروازوں والی گلیوں میں آ کر دبک کر بیٹھ گئے۔ اسی مہینے پاکستان کا نظریہ کانگریس نے تسلیم کر لیا۔ چنانچہ پٹیل کی شہ پر دلی اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کر دیا گیا۔ ہندوستان میں کولیشن وزارت کی ناکامی اور سرحد بندی کے اعلان کے بعد دونوں ملکوں سے مہاجرین کے قافلے چل پڑے اور اس ہمہ گیر قتل عام کا آغاز ہوا جس کی مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں ملتی ہو۔ امرتسر میں مسلمان پولیس والوں

سے اسلحہ واپس لے کر انہیں نوکریوں سے جواب دے دیا گیا۔ گورا فوج واپس چھاؤنی میں بلا لی گئی۔ مسمان فوج کو شہر کی حدود سے باہر نکال دیا گیا۔

شریف پورہ بہت بڑا مہاجرین کیمپ بن گیا۔ جس کے چاروں طرف بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے اپنے مورچے کھود لئے اور مشین گنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔

امرتسر شہر کے اندر سے مسلمانوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ دائم گنج اسلام آباد اور پتلی گھر والی شمالی جانب کی بیرونی بستیاں مسلمانوں سے خالی ہو گئیں۔ وہ لوگ ادھر سے قافلے کی شکل میں لاہور یعنی پاکستان کی طرف چل پڑے۔ چھ ہرٹہ کے قریب سکھوں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور بہت کم لوگ جانیں بچا کر بھاگ سکے۔ اس کا جواب پاکستان سے ہندوستان آنے والے غیر مسلموں کے قافلے پر حملہ کر کے دیا گیا۔ لاہور میں شاہ عالمی کا سارا محلہ جلا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا گیا۔

جالندھر، انبالہ، نابھ، پٹیالہ، روہتک، گورداسپور، ہوشیار پور اور پٹھانکوٹ سے تباہ حال مسلمانوں کے قافلے پاکستان کی طرف چل پڑے۔ برسات کی موسلادھار بارشوں کی وجہ سے دریاؤں میں سیلاب آگیا تھا۔ ہزاروں لوگ سیلاب میں بہہ گئے۔ جو بچ گئے انہیں حملہ آوروں نے چن چن کر بے بسی اور بے کسی کے عالم میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بٹالے میں بھی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ لیکن کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ کوئی گاڑی امرتسر سے بٹالہ نہ جاتی تھی۔ ریل، ڈاک، تار، ہر سرکاری محکمے کا کام معطل ہو چکا تھا۔ ثریا کی کسی کو کوئی خبر نہ تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اس کی خبر لینے کو بے چین تھا مگر کوئی ذریعہ ایسا نہ مل رہا تھا جس کی مدد سے معلوم کر سکتا کہ وہ کس حال میں ہیں۔

کراچی سے مسعودہ کا آخری خط ایک ماہ پہلے ملا۔ جس میں اس نے ہم لوگوں اور اپنے سسرال والوں کی طرف سے گہرے فکر کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد پھر اس کا بھی کوئی خط نہ آیا۔ اور خط کیسے اور کہاں سے آتا۔ ملک میں ہر طرف افراتفری کا عالم بپا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ سارا امرتسر شہر ان سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے میں آچکا تھا جو پولیس اور فوج کی مدد سے چن چن کر مسلمانوں کو قتل کروا رہے تھے۔

امرتسر ہندوستان میں جا چکا تھا۔ لیکن ابھی تک بڑے بوڑھوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ انہیں امرتسر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جانا ہو گا اور اب ان کا کوئی مستقبل نہیں

ہے۔ شہر کا شمالی حصہ سارے کا سارا خالی ہو کر کٹڑہ مان سنگھ میں آگیا تھا۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ کیونکہ دشمنوں کے ساتھ فوج شامل ہو گئی تھی اور مسلمان فوجیوں کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

14 اگست کو یوم آزادی تھا۔

اور امرتسر میں اس رات کو جو فائرنگ ہوئی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ ایک کے بعد دوسری ساری رات لگاتار گولیاں چلتی رہیں۔ کیسری باغ کے پاس ایک گلی میں کوئی ساٹھ مسلمان عورتیں اور مرد قید تھے۔ انہیں باہر نکل کر شریف پورے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک سکھ فوجی نے انہیں اپنی حفاظت میں شریف پورے پہنچایا۔ وہ اس طرح کہ یہ چھوٹا سا مسلمانوں کا لٹا پٹا قافلہ پیچھے پیچھے تھا اور آگے آگے وہ سکھ فوجی مشین گنیں تانے چل رہا تھا۔ شریف پورے کے باہر آکر اس نے سلیوٹ مار کر بلوچ رجمنٹ کے حوالدار کو سلام کیا اور مسلمان عورتوں اور مردوں کو اس کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔

کٹڑہ مان سنگھ میں سعید والی گلی کا آہنی دروازہ بند تھا اور اس کے اندر ارد گرد مسلمان محلوں کے لوگ آکر پناہ گزین ہو گئے تھے اور شریف پورے والے کیمپ میں جانے کے لئے کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی بازار میں ایک نوجوان کشمیری لڑکے کو، جو امرتسر کا بڑا مشہور ہاکی کا کھلاڑی تھا، گورکھا فوجیوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ اکیلا اپنے گھر میں کچھ چیزیں لینے چھپ چھپ کر چھتوں چھتوں گیا تھا۔ اس کی لاش مکان میں ہی پڑی رہی۔ اس کا سارا کنبہ سعید والی گلی میں آگیا تھا۔ جب وہ وحشتناک خبر گلی میں پہنچی تو اس کی بوڑھی ماں اور بہنوں نے وہ واویلا کیا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ محلے کا ایک دلیر نوجوان اپنے ایک ساتھی کو لے کر اس بد نصیب کھلاڑی کی لاش لینے دوسری رات گلی کی چھتوں ہی چھتوں روانہ ہوا مگر ان میں ایک بھی واپس نہ آسکا۔

اس گلی کے لوگوں نے اپنے اپنے گھروں پر کانگریس کے جھنڈے لہرا رکھے تھے مگر اس کا ہندوؤں سکھوں پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ برابر دن رات ان پر گولیاں چلا رہے تھے۔ آخر انہوں نے ایک دن باقاعدہ پروگرام بنا کر اس گلی پر حملہ کر دیا کیونکہ سارے شہر میں صرف یہی ایک گلی ایسی تھی جہاں مسلمان ابھی تک جمے ہوئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے ہتھیار پولیس والوں کو دے رکھے تھے اور صرف اس انتظار میں تھے کہ لیگ کے ٹرک آئیں گے اور انہیں

شریف پورے یا لاہور یا قلعے کے کیمپ میں پہنچا دیں گے۔ اس گلی کا پچھلا دروازہ ایک میدان میں کھلتا تھا جس کی دوسری طرف شریف پورہ تھا اور بلوچ فوجیوں کی چوکی تھی۔ ہندو سکھ فوجیوں کو اس طرف سے حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ ادھر فوجیوں کی مشین گنوں کی زد میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے گلی کے دوسرے دروازے پر آکر ایک دستی بم دے مارا۔ زور کا دھماکہ ہوا اور دروازے کی ایک دو کڑیاں ٹوٹ گئیں۔۔۔۔ گلی میں حشر بپا ہو گیا۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے اور جوان سب کچھ وہیں چھوڑ کر گلی کے دوسرے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ فوجیوں نے دوسرا بم پھینکا اور دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ تیسرے بم پر دروازہ دھڑام سے گلی کے فرش پر آن گرا اور ہندو سکھ شہری تلواریں لہراتے غیر مسلم فوجیوں کی حفاظت میں گلی میں گھس آئے اور انہوں نے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ اس حملے میں سعید کی والدہ دونوں بہنیں اور باپ شہید ہو گئے۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر شریف پورے آسکا۔

شہر مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔

شریف پورے میں تمام مہاجرین آکر جمع ہو گئے۔ لاہور سے پاکستانی اومنی بس کی بسیں ان لوگوں کو پاکستان لے جانے لگیں۔ لوگ مکانوں کو باقاعدہ تالے لگا کر جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب گڑبڑ ختم ہو جائے گی تو وہ واپس امرتسر آجائیں گے۔

اس دوران میں گورداسپور اور جالندھر سے آنے والے قافلوں کا سلسلہ باقاعدہ جاری تھا۔ ادھر ایک قافلہ لاہور کو روانہ ہوتا تو ادھر دوسرا بے خانماں اور بدحال لٹے پٹے اور نیم جاں مسلمانوں کا قافلہ شریف پورے میں آن داخل ہوتا۔ سب لوگ آرہے تھے۔ مگر ثریا اور مسعودہ کے سسرال کا کنبہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب کوئی قافلہ وارد ہوتا تو میں بھاگ کر ان میں جاتا اور ایک ایک آدمی کو غور سے دیکھتا۔ اتنا پتہ چلا کہ پٹیالہ سے ایک قافلہ امرتسر کی طرف چل پڑا ہے۔ سوچا شائد ثریا اسی قافلے میں ہو۔ مگر کیا وہ یہاں تک پہنچ جائے گی؟ مسلمانوں کے قافلوں پر راستے میں بے شمار حملے ہو رہے تھے اور نہ صرف ان کا بے دریغ خون بہایا جا رہا تھا بلکہ ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا جاتا جیسا کہ ہر طرف ہو رہا تھا۔ تو کیا ثریا بھی۔۔۔۔؟ میری روح کانپ سی گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ثریا ضرور واپس آئے گی۔ اسے ضرور واپس آنا ہو گا مجھے اس کی آخری ملاقات

پر اس کی باتیں یاد آگئیں۔ اس نے کہا تھا:

"میرا دل ڈوب سا رہا ہے خالد۔ میں بٹالے نہیں جانا چاہتی اگر میں تم سے پھر نہ مل سکی تو مجھے یاد کر لیا کرنا۔ بھلا نہیں دینا۔۔۔۔" میں خدا سے سارا سارا دن دعائیں مانگتا کہ وہ ثریا اور اس کے گھر والوں کو خیریت سے شریف پورے پہنچا دے۔ لیکن میرا دل مجھے بے چین کئے ہوئے تھا۔ دل یہی کہتا کہ جس طرح ہو سکے بٹالے چل مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہاں کیسے جاؤں؟ کس طرح جاؤں؟

لاہور پاکستان سے غیر مسلموں سے بھری ہوئی گاڑیاں آرہی تھیں۔ اس طرح ادھر سے بھی مہاجرین کی گاڑیاں آرہی تھیں۔ ہمارے محلے کے لونڈوں نے ہندوؤں کے گھروں سے کچھ گاندھی ٹوپیاں بھی لوٹی تھیں۔ جنہیں وہ یونہی مذاق اڑانے کے لئے پہن کر محلے میں پھرا کرتے تھے۔

میں نے دل میں ایک منصوبہ باندھا اور اپنے ایک یار سے ایک گاندھی ٹوپی لے لی۔ ایک روز جب پاکستان سے آئی ہوئی اور پٹھانکوٹ جانے والی ہندو پناہ گیروں کی گاڑی شریف پورے کے باہر سگنل نہ ہونے کی وجہ سے رک گئی تو میں پیچھے سے جا کر چھت پر سوار ہو گیا۔ کیونکہ اس گاڑی میں یہی ایک جگہ تھی جہاں سے ہندوؤں نے ہاتھ اوپر کھینچ کر بٹھا لیا۔ میں نے گاندھی کیپ پہن لی اور ان سے کہا:

"مہاراج کیسا کلجگ آگیا ہے ذرا پیشاب کرنے نیچے اترا ہوں اور دوبارہ کسی نے ڈبے میں گھسنے نہیں دیا۔"

اس ہندو نے جس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں کہا:

"شانت رہیں مہاشہ جی! ہمارے پاس بیٹھ جائیں! کہاں جائیں گے؟" میں نے اسے کہا کہ میں لاہور سے آرہا ہوں اور پٹھانکوٹ اپنے بھائی کے پاس جا رہا ہوں۔ جو ریلوے سٹیشن پر ٹکٹ چیکر ہے۔ میں نے اسے اپنا نام کمل داس بتلایا۔ گاڑی سیٹی دے کر آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگی۔ میں نے اس کی چھت پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی شریف پورے کی بستی کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھا۔ میرا دل لرز سا گیا۔ کیا خبر ادھر سے گزرنا کبھی نصیب نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں موت کے منہ میں جا رہا تھا مگر دل میں اس بات کی

زبردست خوشی تھی کہ میں ثریا کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ دور سے مجھے اپنے مکان کی برساتی دکھائی دی اور گاڑی پٹھانکوٹ لائن کی طرف مڑ گئی۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ کوئی ایک بجے کے قریب یہ سست رفتار گاڑی بٹالے پہنچی۔ کئی لوگ یہاں اتر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اتر گیا۔ ہندو سیوا سمتی اور کانگریسی والنٹیئروں نے ہمیں فوراً اسٹیشن کے باہر والے کیمپ میں پہنچا دیا جہاں ہمیں دال روٹی کھانے کو دی گئی۔ میں نے دوسرے غیر مسلم پناہ گزینوں کے ساتھ مل کر دال روٹی کھائی اور دور سے بٹالے کے مکانوں کو ویران ویران آنکھوں سے دیکھا۔

وہاں پتہ چلا کہ بٹالے کا سارا قصبہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے اور اب وہاں ایک بھی مسلم گھرانہ نہیں رہا۔ میرے دل پر جیسے کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ تو کیا ثریا یہاں سے جا چکی ہے۔ پھر وہ شریف پورے کیوں نہیں پہنچی؟ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا قافلہ یہاں سے صبح روانہ ہوا تھا۔

میں ایک کانگریسی والنٹیئر سے باتیں کر رہا تھا۔ محض یہ پوچھنے کے لئے کہ یہاں مسلمان قتل تو نہیں ہوئے۔ میں نے کہا:

"کیوں مہاراج آپ نے ان مسلوں کو یونہی یہاں سے کیوں جانے دیا"

کانگریسی والنٹیئر ہنس پڑا۔ "جتنا ہم سے ہو سکا ہم نے کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں پاکستان میں بھی ہمارے بھائی پڑے ہیں۔ وہ اسی طرح قافلے بنا کر چلے آ رہے ہیں"

"تو گویا یہاں کے مسلمان قافلہ بنا کر چل دیئے ہیں۔"

"جی ہاں جی ہاں"

اس کا مطلب یہ تھا اس سارے علاقے میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ میں بے خوف و خطر گاندھی ٹوپی پہن کر پھر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کیمپ سے باہر آ کر میں سیدھا ثریا کے مکان کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ان کا مکان سارا جل گیا ہے۔ صرف ملبے کا ڈھیر لگا ہے اور کہیں کہیں لوہے کے گارڈر دوہرے ہو کر اس میں الجھ گئے ہیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسی ملبے میں اس سماوار کی راکھ بھی تھی جس میں اس روز ثریا نے سبز چائے کی پتیاں ڈالی تھیں تو باہر بارش شروع

ہو گئی تھی۔ اسی راکھ میں اس کوٹھڑی کی خاک بھی تھی جس کے اندھیرے میں گم ہو کر میں نے پہلی بار ثریا کے ہونٹوں کی خوشبو محسوس کی تھی اور اس کے سیاہ ابریشمی بالوں میں ناریل کے جنگلات کے خواب دیکھے تھے۔

یہاں سے میں سیدھا مسعودہ کے سسرال میں پہنچا۔ ان کا مکان بھی اسی طرح جل کر ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ اب میں اس الجھن میں تھا کہ وہ لوگ یہاں سے بچ کر نکل بھی سکے ہیں یا نہیں؟ میں نے باتوں ہی باتوں میں ایک سکھ سے پوچھا:

"کیوں جوان تم یہاں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں جی۔ کیا بات ہے لالہ جی؟"

"بات تو کچھ نہیں۔ صرف یہ پوچھنا تھا کہ لاہور میں مسلمانوں نے تو ہمارے کنبے کو شاہ عالمی کی آگ میں بھسم کر دیا اور تم لوگ یہاں خالی مکانوں کو ہی آگ لگاتے رہے۔"

سکھ نے کہا:

"آپ کو کس نے کہا بادشاہو۔ ہم نے تو ان گھروں کا ایک آدمی نہیں جانے-----"

میرے کانوں میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکا۔ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس اسٹیشن آ گیا اور یہاں سے امرتسر جانے والی بڑی سڑک پر ہو لیا۔ میں کرتا، پاجامہ اور گاندھی کیپ میں تھا۔ پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا امرتسر کی سمت روانہ ہو گیا۔ میں اب جان کی بازی لگا کر کسی نہ کسی طرح اس قافلے کو پکڑنا چاہتا تھا جو یہاں سے صبح ہی صبح پاکستان کی طرف روانہ ہوا تھا۔

میں چلتا چلا گیا چلتا چلا گیا۔

راستے میں مجھے کبھی کوئی گھوڑا سوار سکھ۔ نیزہ ہاتھ میں لئے ملتا اور کبھی فوج کی کوئی جیپ کار یا ٹرک تیزی سے گزر جاتا۔ سڑک پختہ تھی۔ اتنی چوڑی نہیں تھی۔ راستے میں گاؤں کے گاؤں ویران پڑے تھے۔ ہر طرف مایوسی ویرانی اور نحوست چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کے لوگ مر کھپ گئے ہیں اور اب ان کی قبروں پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا نہیں۔ کوئی تین چار میل چلنے کے بعد میں تھک گیا اور میرے پاؤں زخمی ہو گئے۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور بدستور سفر جاری رکھا۔ اتفاق سے ایک ہندو کمہار ادھر سے گدھے لے کر

گزرا۔ گدھے بوجھ سے خالی تھے اور بڑی مخصوص رفتار کے ساتھ سڑک پر امرتسر کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

میں نے کمہار کو ایک روپیہ دیا اور اس کے ایک گدھے پر سوار ہو گیا۔ میں نے اُسے یہی بتایا کہ میں مجیٹھ جا رہا ہوں گدھے کی سواری نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ میں نے مزید چار میل کا فاصلہ بڑی آسانی سے طے کر لیا۔ اس کے بعد کمہار اور اس کا گدھا مجھ سے بچھڑ گیا۔ اب میں نے پھر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ جوتا میری ایڑیوں کی کھال ادھیڑ رہا تھا۔ میں نے اُسے پاؤں سے نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ دو میل اسی طرح چلنے کے بعد میں جوتوں سے تنگ آ گیا۔ میں نے انہیں کھیتوں میں پھینک دیا۔

مزید تین میل کی مسافت نے میرا برا حال کر دیا۔ پاؤں میں جگہ جگہ آبلے پڑ گئے اور خون جاری ہو گیا۔ ہونٹ پیاس کی شدت سے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ خدا خدا کر کے ایک چھوٹی سی ندی آئی میں نے وہاں بیٹھ کر پانی پیا۔ ہاتھ منہ دھویا اور پھر آگے کی طرف چل پڑا۔ اب سڑک پر قافلے کے نشان ملنا شروع ہو گئے تھے۔ کہیں کوئی ٹوٹا ہوا جوتا، کہیں کپڑے کا چیتھڑا، کہیں کوئی مٹی کا ٹوٹا ہوا برتن اور کہیں خالی کنستر پڑا ہوا مل جاتا۔

ایک میل چلنے کے بعد مجھے دور سے گرد و غبار اڑتا نظر آنے لگا۔ یہی بٹالے کے مہاجرین کا قافلہ تھا۔ میں نے دیوانہ وار بھاگنا شروع کر دیا۔ اب مجھے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لوگ دکھائی دینے لگے تھے۔ میں نے ذرا فاصلے پر گاندھی کیپ اتار کر دور پھینک دی اور قافلے میں جا کر شریک ہو گیا۔ یہ قافلہ کافی لمبا چوڑا تھا اور کوئی ایک میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ریڑھے تھے، گڈے تھے، تانگے تھے اور پیدل لوگ تھے۔ کئی ایک نے اپنی عورتوں اور بچوں کو گدھوں اور گھوڑوں پر سوار کر رکھا تھا۔ ہر آدمی نیم جان تھا اور موت کے خوف نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا رکھا تھا۔ اس قافلے میں بٹالے کے علاوہ گورداسپور اور ہوشیار پور کے لوگ بھی شریک تھے۔ میں نے ہر عورت ہر مرد کو غور سے دیکھتے ہوئے قافلے کے آگے کے رخ کو چلنا شروع کر دیا۔ اس قافلے کے ساتھ مسلمان فوجیوں کا مختصر سا دستہ تھا جو گھوم پھر کر کافی فاصلے پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

میں نے کافی دور تک دیکھا۔ مگر ثریا، اس کی والدہ اس کے بھائی اور مسعودہ کے سسرال والوں میں سے کسی کی بھی شکل دکھائی نہ دی۔ میری پریشانی اور فکر مندی میں اضافہ ہوتا جا رہا

تھا۔ میں یہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب لوگ اپنے اپنے مکانوں میں زندہ جلا دیئے گئے ہیں۔ میں نصف کے قریب قافلے والوں کو دیکھ چکا تھا کہ اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی۔ وہ عورت ایک ریڑھے پر سوار تھی جس کے پہیے روں روں کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس کے بال خشک ہو کر کھوپڑی سی بن رہے تھے۔ جن میں سڑک کی گرد جم رہی تھی۔ چہرہ سوکھ کر مرجھا گیا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک طرف تکے جا رہی تھی ـــــ میں نے اُسے بمشکل پہچانا۔ یہ ثریا کی والدہ تھی۔

میں بھاگ کر اس کے پاس گیا۔

"خالہ جان!"

میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ اس عورت نے ٹکٹکی باندھ کر اپنی پھٹی پھٹی سفید بے جان آنکھوں سے دیکھا اور دیکھتی چلی گئی۔ اس نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا جو برف کی طرف ٹھنڈا تھا۔ "خالہ جان میں خالد ہوں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

پتھر کے بت میں حرکت ہوئی اور بت چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ خالہ کی بے جان باہیں میرے گلے میں تھیں اور وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور ریڑھا جوں کی چال چلا جا رہا تھا۔ قافلے والوں میں سے کوئی بھی ہماری طرف تعجب سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس قسم کے مناظر دیکھ دیکھ کر ان کے دل پتھر کے ہو چکے تھے۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ثریا کہاں ہے خالہ جان"

"ہائے ـــــ یہ کیا ہو گیا بیٹا۔ ثریا اگلے ریڑھے میں ہے۔ ہائے خالد بیٹا کیا ہو گیا۔" جب مجھے ثریا کی زندگی کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے دوسرے لوگوں کا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ مسعودہ کے سسرال کا سارا کنبہ تہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ ثریا کے دونوں بھائی بھی شہید ہو گئے ہیں اور اُس سارے خاندان میں سے صرف یہ دونوں عورتیں جان بچا کر کیمپ میں پہنچ سکی تھیں۔ انہوں نے میرے گلے سے باہیں نکال کر اپنے گلے میں ڈال لیں اور اپنے ایک ایک بیٹے اور اس کے بچوں کا نام لے لے کر بین کرنے لگیں۔ مجھ سے ان کی حالت نہ دیکھی گئی۔ میں بھاگ کر دوسرے ریڑھے کے قریب گیا۔

یہ ریڑھا عورتوں اور بچوں سے منہ در منہ بھرا ہوا تھا۔ یہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جس کی پشت اور چہرے کا ایک رخ میری طرف تھا۔ وہ ریڑھے کے سب سے اخیر میں بانس کے ساتھ سر لگائے گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بالوں میں گرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر کچھ نہیں تھا۔ بال گلے میں پڑے تھے قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی جس میں سے میلی سی بنیاین دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے پر خاک اڑ رہی تھی۔ رنگ کالا پڑ گیا تھا اور گردن پر سیاہی سی جم رہی تھی۔

یہ ثریا تھی۔

امرتسر کے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی طالبہ ثریا! مجھے سردیوں کی رومانی راتوں میں سماوار میں سے انڈیل کر گرم گرم سبز چائے پلانے والی ثریا، میرے خوابوں کی ملکہ ثریا، کمپنی باغ کے گنجان باغوں میں مجھ سے محبت کے پیمان باندھنے والی اور مجھے اپنی گہری گہری پر اسرار محبت بھری آنکھوں سے تکنے والی ثریا! میں آہستہ سے اس کے قریب آ گیا اور چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے ریڑھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ریڑھے پر بیٹھی ہوئی دوسری عورتوں کی حالت بھی ایسی ہی تھی کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا۔ کسی کو میری طرف دھیان دینے کی فرصت نہ تھی۔ ہر عورت اپنے اپنے غم مردہ بچے کی طرح سینے سے لگائے سرخ آنکھوں سے خشک آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے ثریا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس ہاتھ کی گرمی اور غیر فانی لمس نے حیرت انگیز اثر کیا۔ ثریا نے آنکھیں کھول دیں اور آہستہ سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ دو خاک اڑاتے صحراؤں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ثریا کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ میرے بازوؤں میں زور سے بھینچ دیا اور اس کا سارا جسم یوں ہلنے لگا جیسے اس پر رعشہ طاری ہو گیا ہو۔

"آپ ----- آپ کہاں؟"

ثریا نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری تلاش میں ----- تم لوگ امرتسر نہ پہنچے تو میں آ گیا۔ کیمپ سے پتہ چلا کہ قافلہ جا چکا ہے۔ مجھے بھائیوں کا بڑا افسوس ہے ثریا خدا کی یہی مرضی تھی۔"

ثریا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ میں نے اسے تسلی

دیتے ہوئے کہا:

"حوصلہ کرو ثریا۔ یہاں ہر ماں کا بچہ، ہر بہن کا بھائی اور ہر دوسری بیوی کا خاوند شہید ہوا ہے۔ یہ قیامت کی گھڑی ہے۔ خدا سے دعا مانگو کہ وہ ہمیں سلامتی کے ساتھ کیمپ میں پہنچا دے۔"

ثریا نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھے اور نقاہت کے عالم میں اپنا سر ریڑھے کے بانس کے ساتھ لگا دیا۔ میں فوراً پچھلے ریڑھے کی طرف آیا اور وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں کی منت سماجت کرنے کے بعد ثریا کی والدہ کے لئے تھوڑی سی اور جگہ بنائی اور بمشکل ایسا انتظام کر سکا کہ ان کے پاؤں چلتے ہوئے پہیے سے رگڑ نہ کھائیں۔

ہزاروں مہاجرین کے اس قافلے کا بہت برا حال تھا۔ نہ کھانے کو نہ پینے کو تھا۔ کوئی نہر راستے میں آتی تو سارا قافلہ جانوروں کی طرح ندی کی طرف دوڑ پڑتا۔ کھانے کو فوجیوں نے چنے تقسیم کر رکھے تھے مگر وہ اس قدر تھوڑی مقدار میں تھے کہ بمشکل نصف لوگ اپنا پیٹ بھر سکے۔ دوسرے سب سے زیادہ خوف قافلے پر حملہ ہو جانے کا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان فوج کے سپاہی قافلے کے ساتھ تھے مگر ان کی تعداد اتنی مختصر تھی کہ شاید زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے جو عام طور پر سینکڑوں کی تعداد میں ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہوتے تھے۔ اس سے پہلے والے قافلوں کے ساتھ یہ ہوتا رہا تھا کہ غیر مسلم لوگ مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار پیچھے یا قافلے کے عین درمیان میں کسی جگہ کھیتوں میں سے نکل کر اچانک حملہ کر دیتے اور جب تک آگے سے فوجی وہاں پہنچتے وہ مہاجرین کو شہید کر کے اور عورتوں کو اغواء کر کے لے جا چکے ہوتے۔

مجھے بھی یہی خدشہ تھا کہ کہیں یہی مصیبت اس قافلے پر بھی نہ پڑے۔ ایسی صورت میں اس قافلے کی تباہی یقینی تھی۔ شریف پورے کا کیمپ پندرہ میل رہ گیا تھا۔ گرمی کی شدت سے دم گھٹ رہا تھا۔ بے حد حبس ہو رہا تھا۔ دھوپ انتہائی تیزی سے لہک رہی تھی۔ ہزاروں لوگوں کے ساتھ میں بھی پاؤں سے ننگا تھا اور میرے پاؤں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ منہ سر مٹی میں اور گرد کی وجہ سے خاکستری ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر خشک پیپڑیاں جم گئی تھیں۔ بار بار پیاس لگ رہی تھی مگر پانی صرف ایک آدھ بار ہی نصیب ہو رہا تھا۔ ایک جگہ ندی آئی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک بوتل بھر کر پانی حاصل کیا۔ پانی گدلا اور ریتلا تھا۔ مگر اس وقت وہ آب حیات سے کم نہیں تھا۔ میں نے پہلے تھوڑا سا پانی ثریا

کی والدہ کو پلایا اور پھر ثریا کو لا کر دیا۔ سب سے آخر میں مَیں نے پیا اور ایک بوتل اور بھر کر ساتھ رکھ لی۔

اس وقت یہ قافلہ ہندو سکھوں کے ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہاں پاکستان سے آتے ہوئے غیر مسلم مہاجرین بھی تھے جنھوں نے کچھ اصلی اور کچھ من گھڑت اشتعال انگیز قصے سنا سنا کر لوگوں کے دلوں میں انتقام کی آگ سلگا رکھی تھی۔ جب قافلہ گاؤں کے قریب سے گزرا تو ذرا فاصلے پر کھیتوں میں کھڑے لوگوں نے جو ہمارا تماشہ دیکھ رہے تھے گالیوں اور طنزیہ جملوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم لوگ چپ چاپ گزر گئے۔

اس وقت ہماری فوج کے سپاہیوں نے زمین پر لیٹ کر مشین گنوں کے منہ گاؤں کی طرف کر دیئے تھے۔ اس خیال سے کہ اگر ان لوگوں نے قافلے پر حملہ کیا تو اس کا دندان شکن جواب دیا جا سکے۔ مگر اس وقت کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ مسلمانوں کے قافلے پر حملہ کرتا۔ جب قافلہ گاؤں سے دور چلا گیا اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اتنی دیر بالکل سہمے رہے تھے۔ ثریا کا حال بے حد پریشان تھا۔ اسے اب دوہری پریشانی تھی۔ جس میں میرا غم اور میری زندگی کا خیال بھی شریک تھا۔ وہ بار بار اپنی پھٹی پھٹی نگاہوں سے پاگلوں کی طرح مجھے دیکھتی اور سر جھکا لیتی۔

ہمارا ریڑھا جس پر عورتیں اور بچے سوار تھے قافلے کے قلبی حصے سے تھوڑا سا پیچھے کی طرف تھا۔ ان عورتوں میں زیادہ تر دیہاتی تھیں۔ اور غم و اندوہ سے جوان لڑکیاں بوڑھی اور بوڑھی عورتیں مردہ معلوم ہو رہی تھیں۔ ان کے لواحقین سر جھکائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک دیہاتی نے اپنے مفلوج باپ کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ تھک کر ایک جگہ گر پڑا۔ لوگوں نے بوڑھے کو ایک گڈے پر بٹھانا چاہا۔ عورتوں نے اسے بٹھلانے سے انکار کر دیا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو بہنو! حشر کے میدانوں میں خدا کو کیا جواب دو گی؟" ایک بوڑھی عورت بولی۔

"اس سے بڑا حشر کا میدان کہاں لگے گا۔ جب یہاں خدا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تو وہاں کہاں ملے گا؟"

"کفر نہ بولو مائی! خدا کے غضب سے ڈرو۔ خدا نے ہمیں ہمارے اعمال کی سزا دی ہے۔"

مائی نے کہا۔

"اور جو پاکستان کے دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ کیا ان سب کے اعمال اچھے ہیں۔"

عورتوں نے مفلوج بوڑھے کو گڈے پر بیٹھنے ہی نہ دیا۔ اس کے سعادت مند بیٹے نے اس بوجھ کو پھر اٹھا لیا اور چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ گر پڑا۔ فوجی سپاہی نے سنگین کی نوک دکھا کر ایک ریڑھے میں بوڑھے کو بٹھلا دیا۔

قافلہ پھر آگے کو روانہ ہو گیا۔

قافلہ جوں کی چال رینگ رہا تھا اور شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے اور جب دن کی روشنی ہلکے ہلکے اندھیروں میں گم ہونے لگی تو بارش شروع ہو گئی۔ بارش نے ایک دم موسلا دھار صورت اختیار کر لی اور بجلی رہ رہ کر کڑکنے لگی۔ لوگوں پر یہ ایک اور بلائے ناگہانی ٹوٹی۔ قافلہ روک دیا گیا۔ لوگ سڑک کنارے درختوں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ عورتیں وغیرہ ریڑھوں، گڈوں کے نیچے دبک کر بیٹھ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک جل تھل ہو گئی۔ میں ثریا کی والدہ کو بھی ثریا والے ریڑھے کے نیچے ہی لے آیا۔ بارش کا پانی میری پنڈلیوں تک آ گیا تھا۔ ثریا کے جسم کا ایک حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا لباس قافلے کی دوسری عورتوں کی طرح بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا تھا۔ بال گلے میں گیلی رسیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ میں نے ایک جگہ سے کچھ اینٹیں لا کر انہیں دیں تاکہ وہ ان پر بیٹھ جائیں اور پانی سے بچ جائیں مگر یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی۔ وہاں تو جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پانی سے بچنے کی کس کو فکر تھی۔ ایکا ایکی پیچھے کی طرف سے چیخوں کا شور بلند ہوا۔ سب کے کلیجے دہل گئے۔ دو فوجی پانی میں شڑاپ شڑاپ بھاگتے ہوئے پیچھے کی جانب بھاگے۔ معلوم ہوا کہ دو نوجوان دیہاتیوں کو کالے ناگ نے ڈس لیا ہے اور وہ مر گئے ہیں۔

باقی لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محض سانپ کا معاملہ تھا اور حملہ آور نہیں تھے۔

مگر جب رات ہوئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور بارش تیز ہو گئی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے لگا تو اچانک ہندو سکھوں کا ایک بہت بڑا جتھہ نمودار ہوا اور اس نے قافلے پر واقعی حملہ کر دیا۔ یہ حملہ بالکل اچانک کیا گیا تھا۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ حملہ آور بائیں طرف سے قافلے کے بالکل درمیان

کے حصے میں آئے اور انہوں نے آتے ہی عورتوں کا اغواء کرنا اور مردوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ چاروں طرف ایک کہرام مچ گیا۔ بارش، پانی، اندھیرا، کسمپرسی کا عالم اور حملہ آوروں کے نیزے، تلواریں اور بندوقیں! لوگوں نے اپنے اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر جس طرف منہ اٹھا بھاگنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح کوئی کھیت میں ڈھیر کر دیا گیا اور کسی کو ذرا فاصلے پر موت نے آگھیرا۔

مسلمان فوجیوں نے دھڑا دھڑ فائرنگ شروع کر دی۔ مگر حملہ آور اتنی زیادہ تعداد میں تھے کہ انہیں مرنے کے لئے بھی آدھ گھنٹہ چاہیئے تھا اور آدھ گھنٹے میں وہ آدھے قافلے کا صفایا کر سکتے تھے۔ حملہ آوروں نے ٹارچیں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔ ہر طرف سے عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی آہ و بکا بلند ہونے لگی۔

حملہ آور بڑی بے دریغی اور درندگی کے ساتھ قافلے والوں کا خون بہا رہے تھے اور جو عورت ہاتھ آئی اسے اٹھا کر گھوڑی پر ڈال بھاگ اٹھتے۔

میں ثریا اور اس کی والدہ کے پاس تھا۔ دونوں عورتیں سہم سی گئی تھیں اور ان کے بدن لاشوں کی طرح سرد ہو چکے تھے۔ میں نے دوسری عورتوں سے ہٹ کر ان دونوں کو ریڑھے کی آڑ میں چھپا رکھا تھا اور خود ان کے آگے بیٹھ گیا تھا۔ خوفزدہ میں بھی تھا، پسینے میرے بھی چھوٹ رہے تھے۔ وہ گھڑی ہی ایسی تھی زندگی اور موت اور ذلت میں نیزے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں کچھ نہ سوچ رہا تھا، میں کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔ ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ رہے تھے۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا جس کے مدد سے میں چند لمحوں کے لئے ہی اپنی زندگی اور ان شریف النفس خواتین کی عزت کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو سکتا۔ فوجی برابر گولیاں چلا رہے تھے۔ حملہ آور بھی گر گر کر مر رہے تھے مگر وہ قافلے والوں پر برابر حملے کئے جا رہے تھے۔

اچانک بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں میں ایک پل کے لئے بالکل جامد ہو کر رہ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب اس حملہ آور کا نیزہ میری طرف بڑھا تو میں لپک کر اس سوار کی ٹانگ سے لپٹ گیا اور اسے اپنی پوری قوت سے کھینچ کر زمین پر گرا لیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اتنے میں اس کے دو اور ساتھی آ گئے۔ ایک نے نیزے سے مجھ پر حملہ کر دیا نیزہ میری ران میں اندر تک گھس گیا۔ میں پانی میں گر پڑا۔

وہ لوگ ثریا اور اس کی ماں کی طرف لپکے۔ ثریا نے زور سے چیخ ماری اور ایک طرف اٹھ دوڑی۔ میں نے چلا کر ثریا کو آواز دی۔

"مت جاؤ، مت جاؤ"

اوئے مسلیا حالی جیوناں ایں۔"

اس کے ساتھ ہی حملہ آور نے دوسرا نیزہ مارا جو میرے کندھے پر لگا اور میں درد کی شدت سی نڈھال ہو کر گر پڑا۔

ثریا کی ماں نے دوہتڑ مار کر سر پیٹ لیا اور قمیض کا گریبان پھاڑ کر پاگلوں کی طرح چلائی۔

"مار ڈالو---- جلدی مار ڈالو۔ نہ دیکھو میرے بیٹو! مجھے مار ڈالو مجھ پر احسان ضرور کرو، مارو---- خدا کے لئے مار دو۔"

ایک حملہ آور نے نیزہ مار کر ثریا کی ماں اور میری خالہ کا سینہ چھلنی کر دیا۔ ثریا کی ماں کے منہ سے غراہٹ سی نکلی اور وہ ریڑھے کے پہیے پر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ بجلی زور سے چمکی اور میں نے اس کی چمک میں ثریا کو پاگل عورتوں کی طرح کھیتوں کی طرف پانی میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ایک حملہ آور اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ کچھ نہ سن سکا۔ پھر میری آنکھوں میں گہرا دبیز نفرت انگیز اندھیرا چھا گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو میں کیچڑ اور خون میں لت پت سڑک کنارے پڑا تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ میرے ارد گرد ان گنت لاشیں پڑی تھیں۔ ریڑھے الٹ گئے تھے۔ سامان بکھرا پڑا تھا۔ کوئی زخمی کراہ رہا تھا اور پانی مانگ رہا تھا۔ اور کوئی پانی مانگ مانگ کر سے گھرانے کی عزت کو اپنے نوکیلے پنجوں والی گرفت میں لے لیا ہو گا۔ وہ چیخی نہیں ہو گی، چلائی نہیں ہو گی، جسم سرد پڑ گیا ہو گا اور دوسرے لمحے ایک لاش اس حملہ آور کے کندھے پر لدی ہو گی جسے وہ اپنے گھوڑے پر لاد کر کسی نامعلوم سمت کو روانہ ہو گیا ہو گا۔

ثریا!

مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں کے پاس منہ لا کر کسی نے ثریا کو آواز دی ہو۔ میرا جسم لرز اٹھا۔ ران سے زخم سے اٹھی ہوئی ٹیس کندھے کے زخم سے جا کر مل گئی اور شدید درد

کے اس پل پر میں بے ہوشی کے عالم میں کبھی ثریا کو اور کبھی اس کی والدہ کو کبھی اپنی والدہ کو اور کبھی اپنے بھائی بہنوں کو پکارتا رہا اور زخموں سے چور لٹا پٹا قافلہ امرتسر کی طرف روانہ ہو گیا۔

سارا دن یہ مختصر سا قافلہ، جس کا بیشتر حصہ قتل کر دیا گیا تھا جس کے ہر مرد کے سینے پر گولیوں کے زخموں سے بھی زیادہ گہرا اور زہر سے بھی زیادہ زہریلا داغ تھا اور جس میں اب سوائے چند ایک بوڑھی عورتوں کے کوئی جوان لڑکی نہ تھی زخمی سانپ کی طرح اپنی منزل کی طرف، اپنے بل کی طرف رینگتا رہا۔

زخمیوں کی آہ و بکا اور عورتوں کا واویلا قافلے کے ساتھ ساتھ گیا۔ فوجی بڑی جانفشانی سے ہر ایک کی دیکھ بھال کر رہے تھے مگر وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ان کے پاس بڑا محدود اسلحہ تھا۔ اس زبردست حملے میں ان کے بھی دو جوان شہید ہو گئے تھے۔ جنہیں انہوں نے دوسرے شہیدوں کے ساتھ ہی وہاں گڑھے کھود کر دفن کر دیا تھا۔ وہ مجبور تھے اور ہاتھ مل رہے تھے کہ وہ ہماری مدد نہ کر سکتے تھے۔ پھر بھی یہ ان کی ہمت تھی کہ قافلہ اس بے بسی کے عالم میں بھی ایک بار پھر پاکستان کی طرف، شریف پورے والے بڑے کیمپ کی طرف چل پڑا تھا۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتے تو باقی کے زخمی بھی وہیں تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئے ہوتے۔

درد کی شدت سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں ادھر اُدھر سر مار رہا تھا۔ درد یوں لگ رہا تھا جیسے پتھر کی طرح میرے جسم کے اندر جم گیا ہے اور ہلنے کا نام نہیں لے رہا۔ میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ زبان خشک ہو کر باہر کو نکلی جا رہی تھی۔ ہونٹوں پر زخم ہو گئے تھے اور بدن کی کھال دھوپ کی تپش اور نقاہت کی وجہ سے سرخ ہو کر پھٹنے لگی تھی۔ ثریا کی ماں کی اندوہناک موت اور ثریا کی ہولناک جدائی کا غم دل پر پتھر کی سل بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ سمجھ

تھک گیا تھا اور ہمیشہ کی نیند سو گیا تھا۔

میری ٹانگ اور کندھے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ دائیں کندھے پر خون جم گیا تھا۔ سارا جسم خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ران پر بھی خون جما ہوا تھا۔ اس میں کیچڑ مل گیا تھا۔ سر پتھر ہو رہا تھا۔ نقاہت کے مارے گردن بڑی مشکل سے ہل سکتی تھی۔ میرے بالکل سامنے ریڑھے کے پہیے کے پاس ثریا کی والدہ مری پڑی تھی۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور سینے پر گہرا سوراخ تھا۔ جس سے میں خون ابل ابل کر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھوں میں سفید دیدے

چڑھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں پھٹی ہوئی قمیض کی دھجی تھی اور دوسرا ہاتھ ریڑھے کے پہیے میں الجھا ہوا تھا۔ جیسے موت کی آخری کش مکش میں اس پہیے کا سہارا لینے کی کوشش کی ہو۔

جو لوگ بچ گئے تھے اپنی اپنی عورتوں کی لاشیں تلاش کر رہے تھے۔ فوجی زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر گڈوں میں لاد رہے تھے۔ دو فوجیوں نے مجھے بھی اٹھا کر گڈے میں لادنا چاہا۔ میں نے ثریا کی والدہ کی لاش کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ میری ماں کی لاش ہے اسے ----- اسے دفن کر دو پھر مجھے لادنا -----"

فوجیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے ثریا کی والدہ کی لاش کو اٹھایا ایک فوجی نے قمیض اتار کر بوڑھی ماں کے سینے پر ڈال دی۔ دو فوجیوں نے مجھے گڈے پر لادا اور پھر انہوں نے میرے سامنے وہیں زمین کھود کر ایک گڑھے میں ثریا کی ماں کو اس میں دفن کر کے اس پر کیچڑ ملی مٹی ڈال دی۔ میری آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ میری زبان پر کسی کے خلاف حرفِ شکایت نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں کسی کے سینے میں گھونپنے کے لئے انتقام کا خنجر نہیں تھا۔ میرا ایک ہاتھ دل پر تھا اور دوسرا ران کے زخم پر، جہاں درد کی ٹیس نیزے کی انی بن بن کر چبھ رہی تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے باجرے کا وہ کھیت تھا جس کی طرف بجلی کی چمک میں مَیں نے ثریا کو دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی اسے پکڑنے کے لئے بھاگتا جا رہا تھا۔ اس نے ثریا کو ضرور پکڑ لیا ہو گا۔

معصوم کمزور لڑکی کتنی دور تک بھاگ سکتی تھی؟ تھوڑی دور جا کر ہی اس کا دم پھول گیا ہو گا۔ اور وہ بے دم ہو کر گر پڑی ہو گی اور شکاری کا تیر ہرنی کے پہلو میں پیوست ہو گیا ہو گا۔ اس آدمی نے اس کانپتی ہوئی رنگ اڑی، منہ فق، پھٹی آنکھوں والی بٹالے کے ایک چھوٹے

میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہو گی۔ کس عالم میں ہو گی۔ کس کے پاس ہو گی۔ کیا کر رہی ہو گی۔

خدا کرے کہ وہ مر گئی ہو۔ کاش ایک نیزہ اس کے سینے سے بھی پار ہو جاتا اور اس کی لاش کو میں اپنی آنکھوں کے سامنے دفن ہوتے دیکھ لیتا۔ پھر شاید مجھے اتنا شدید صدمہ، اتنا درد انگیز قلق نہ ہوتا۔ میں نے درد سے نڈھال ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکل کر مجھے سنائی دی اور مجھے چیخ کسی زخمی جانور کی محسوس

ہوئی۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

شام کے وقت یہ خانماں برباد قافلہ شریف پورے کے کیمپ کے باہر پہنچ گیا۔ اس قافلے کے قتل عام کی خبر وہاں پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ ان لوگوں نے دوا دارو کا سب انتظام کر رکھا تھا۔

قافلہ شریف پورے کی آبادی میں داخل ہوا تو وہاں ایک شور قیامت مچ گیا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے زخمیوں کو اتار اتار کر چارپائیوں پر ڈالا۔

لوگوں کا ہجوم اپنے اپنے رشتہ داروں کی تلاش میں آ گیا۔ میرے بھائیوں اور والد صاحب نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مجھے اسی وقت چارپائی پر ڈال کر گھر لے گئے۔ میں ایک بار پھر مر کر زندہ ہو گیا تھا۔

ایک ہفتہ تک میں بستر پر پڑا رہا اور میری مرہم پٹی اور دیکھ بھال ہوتی رہی۔

میں نے ان لوگوں کو اس موت کے سفر کی ایک ایک تفصیل سنائی۔ وہ لوگ حیران رہ گئے کہ میں نے کس طرح یہاں سے گاندھی کیپ پہن کر بٹالے جانا گوارا کیا۔ ثریا کی گمشدگی، اس کی والدہ کی کرب انگیز موت، اس کے بیٹوں کی شہادت اور مسعودہ کے سسرال کے سارے کنبے کے قتل کا سن کر گھر میں کئی روز تک صف ماتم بچھی رہی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان بدقسمت لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا ہو گا۔

میں سارا دن نچلے کمرے میں چارپائی پر پڑا رہتا۔ شریف پورہ چونکہ پہلے ہی سے بہت بڑی آبادی تھی۔ اس لئے وہاں ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ میرا علاج ڈاکٹر لطیف الرحمان نے بڑی تندہی سے کیا اور میں گیارہ دنوں میں اس قابل ہو گیا کہ چھڑی ہاتھ میں لے کر گلی میں آہستہ آہستہ چل پھر سکوں۔

اس دوران میں سعید برابر میرے ساتھ رہا۔ ثریا کے اغواء کا اسے بھی بے حد صدمہ ہوا تھا۔ وہ میرے غم میں شریک ہو کر اپنے گھرانے کے قتل عام کا غم بھول گیا تھا۔

یوں تو میں اس سے بات کر کے کسی وقت تھوڑا بہت خوش ہو جایا کرتا لیکن جونہی ثریا کا خیال آتا دل کو ایک دھکا سا لگتا اور میں ایک دم کسی گہری اور اداس سوچ میں گم ہو جاتا۔ سعید نے اب ناصح مشفق بننا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ میری محبت اس کی نصیحتوں سے بہت آگے جا چکی تھی۔ گھر والوں پر بھی یہ بات واضح ہو چکی تھی

کہ میں ثریا سے محبت کرتا تھا۔ ورنہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر جلتی آگ میں نہ کودتا۔ وہ بھی میری ہر طرح سے دلگیری کیا کرتے۔ کبھی کوئی ثریا کا میرے سامنے ذکر نہ کرتا۔ اگر مجھے اداس دیکھتے تو ہر طرح سے جی بہلانے کی کوشش کرتے۔ مگر میرے غم کا علاج، میرے درد کا مداوا کسی کے پاس نہ تھا۔

امرتسر مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ پاکستان سے ہر روز اومنی بس والوں کی لاریاں اور ریل گاڑی آتی اور مسلم مہاجرین کو لاد کر پاکستان لے جاتی۔ ابھی ہماری باری نہیں آئی تھی۔ لوگوں نے مکانوں کو خالی کر کے سارا سامان باندھ کر تیار کر رکھا ہوا تھا۔ آخر ایک روز ہماری باری بھی آ گئی۔ وہ گھڑی بھی آ گئی جب ہمیں امرتسر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ کمپنی باغ، شریف پورے ------ کی نہر، پھلوں کے گنجان باغوں اور اپنے شریف پورے والے مکان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ اب امرتسر وہ امرتسر رہا بھی نہیں تھا۔ اب پھر کبھی میں ثریا کے ساتھ پہلو بہ پہلو کمپنی باغ کی روشوں پر نہیں گھوم سکتا تھا۔ کبھی کرسٹل ہوٹل میں بیٹھ کر اس کے ساتھ چائے نہیں پی سکتا تھا۔ وہ باہمی فہم و تفہیم کی فضاء وہ دوستانہ ماحول ختم ہو چکا تھا۔ پہلے کبھی کسی سکھ کو دیکھ کر یہ خیال نہیں آتا تھا کہ یہ سکھ ہے۔ اب دو فرلانگ سے ہی اس کی بو آ جاتی تھی۔

جہنمی آگ کے شعلوں نے درختوں، پھولوں، پرندوں کو بھسم کر ڈالا تھا۔ باغ اجڑ گئے تھے۔ روشنیاں ویران ہو گئی تھیں اور گلیوں میں رات کو مرے ہوؤں کی زخمی روحیں بین کرتی پھرتی تھیں۔

غالباً 28 اگست کی دوپہر تھی۔

امرتسر کے آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ ہم اپنے گھر کو تالا لگا کر باہر ریلوے لائن کے پاس سامان لئے بیٹھے تھے۔ تالا یونہی لگا دیا تھا ہم مکان کو اس حالت میں نہیں چھوڑنا چاہتے تھے کہ اس کے دروازوں اور کھڑکیوں کی پھٹی پھٹی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوں۔ اتنے میں سٹیشن کی طرف سے ایک بے حد لمبی گاڑی آ کر جھٹکے سے ہمارے پاس رک گئی۔ جس طرح ہسپتال کا سٹریچر مریض کے بستر کے پاس آ کر رک جاتا ہے۔ سب لوگ اس میں سوار ہونا شروع ہو گئے۔ ہمارا کنبہ بھی ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اب ہم گاڑی میں بیٹھے تھے اور بلوچ فوج کے جوان گاڑی کی دونوں جانب مشین گنیں اٹھائے اس کی حفاظت

کر رہے تھے۔

بادلوں میں بٹالے کی طرف سے دھیمی دھیمی گرج سنائی دی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ انجن نے وسل دیا اور ریل لاہور کی طرف چل پڑی، پاکستان کی طرف روانہ ہو گئی۔

الوداع! میرے پیارے گھر!

اب پھر کبھی ایک ساتھ مل بیٹھنا نصیب نہ ہو گا۔ اب پھر کبھی تیری شہ نشین میں بیٹھ کر کسی کو محبت بھرے خط نہیں لکھے جائیں گے۔ ہم نہیں ہوں گے مگر تو اس آسمان تلے ان بادلوں کی بارش کے سائے میں زندہ رہے گا۔ اس بد نصیب بادشاہ کی طرح جسے اس کے وزیر نے مرگِ تاخیر کا زہر دے دیا ہو۔ تو کچھ دیر زندہ رہے گا۔ لیکن کسی اور فضاء میں، کسی اور طرزِ تکلم میں ---- ! اگر کبھی ہماری اغواء شدہ محبت کا ادھر سے گزر ہو تو ہمارا ہاتھ جوڑ کر سلام کہنا!

الوداع! میرے پیارے!

الوداع!

گاڑی آہستہ آہستہ لگی بندھی رفتار کے ساتھ امرتسر کے پلیٹ فارم میں سے گزرتی چلی گئی۔ اب بارش تیز ہو گئی تھی۔ چھہرٹہ سٹیشن آیا۔ پھر حاصہ پھر اور پھر اور ---- ہر جگہ ویرانی چھائی ہوئی تھی اور سوگ ایسا عالم طاری تھا۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ موت کی چیخ کے بعد کا سناٹا! جگہ جگہ بھارتی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جو ہمیں بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہم اسے ناخواندہ مہمان کی طرح دیکھ رہے تھے۔

گاڑی پاکستان کا باڈر کراس کر گئی۔

پاکستانی جھنڈا دیکھ کر لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ بلوچی جوانوں نے خوشی سے ہوا میں فائر کئے آخر لاہور کا بہت بڑا جنکشن آ گیا۔ یہاں مسلم لیگ کے ورکروں کا باقاعدہ انتظام تھا۔ باہر کیمپ لگے ہوئے تھے۔ جہاں کھانے کی ہر شے موجود تھی۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر سیدھے انار کلی اپنے رشتہ داروں کے ہاں آ گئے۔ کچھ دن ان کے ہاں رہے پھر والد صاحب اور بھائیوں نے مل ملا کر نسبت روڈ پر ایک مکان الاٹ کروا لیا۔ ہم سب اس مکان میں آ گئے۔ لاہور میں تمام کاروبار معطل ہو چکے تھے۔ صرف ایک

آنہ گلاس لسی، آلو چھولے، آنہ کپ چائے اور تیل مالش کا کام زوروں پر تھا۔ اس طرح دن گزرتے چلے گئے۔ کاروبار بتدریج معمول پر آیا۔ دونوں جانب سے مہاجرین کے قافلوں کی آمدورفت بند ہو گئی۔ لوگوں نے اپنے اپنے زخموں کا معائنہ شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ انہیں اپنے نقصان کا اندازہ ہونے لگا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس ہونا شروع ہو گیا کہ اب یہی ان کا وطن ہے اور اسی ملک کو انہوں نے اپنی محنت سے ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک لے جانا ہے۔ دفتروں میں کام شروع ہو گیا۔ سڑکوں کی مرمت کر دی گئی۔ جلے ہوئے خطرناک مکانوں کو زمین بوس کرنے کا کام شروع ہو گیا لوگوں کو جہاں جہاں بیٹھنا تھا بیٹھ گئے اور اپنے اپنے کاروبار کی فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک سال گزر گیا۔

مسعودہ لاہور آ گئی تھی۔ اس نے پہلے ہم سبھوں کو کراچی لے جانا چاہا مگر والد صاحب راضی نہ ہوئے۔ مسعودہ کو اپنے سسرال کے المیے کی خبر ملی تو کئی روز تک ہمارے گھر میں صف ماتم بچھی رہی۔

والد صاحب نے اور بھائیوں نے اب اپنا پرانا کاروبار یہاں شروع کر دیا تھا۔ میں نے بھی ریلوے میں دوبارہ نوکری کر لی تھی۔ روز صبح دفتر جاتا اور شام کو گھر آ کر پڑ رہتا۔ اگر کوئی دوست واقفِ حال تھا تو وہ صرف سعید تھا۔ جس کے ساتھ بات کرنے سے جی کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔

تیسرے سال میں دونوں ملکوں میں بازیافتہ خواتین کا کام بڑی تیزی سی شروع ہو گیا۔ مغویہ عورتیں کیمپوں میں لا کر رکھی جانے لگیں۔ ان کے لواحقین انہیں وہاں سے جا کر اپنے اپنے گھر لے آتے۔ میں ہر روز سعید کے ساتھ بازیافتہ خواتین کے کیمپ کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ لیکن نخل امید بار آور نہیں ہو رہا تھا۔ کئی بد نصیب لڑکیاں وہاں آتیں۔ لیکن ثریا کی شکل کہیں دکھائی نہ دیتی۔

اسی طرح ایک سال کا مزید عرصہ گزر گیا میں نے مغویہ خواتین کے کیمپ کا چکر لگانا نہ چھوڑا۔

ثریا کی جہاں منگنی ہوئی تھی اتفاق سے ان کی عورتیں پتہ کرتی کرتی ہمارے گھر آئیں۔ یہاں آ کر جب انہیں معلوم ہوا کہ ثریا ہمارے ساتھ پاکستان نہیں آ سکی اور اغواء کر لی گئی ہے تو انہوں نے جھوٹ موٹ کے افسوس کا اظہار کیا اور سوڈالیمن کی نصف درجن

بوتلیں پی کر جوتیاں کھٹکھٹاتیں واپس چلی گئیں۔

اس کے بعد ہمیں خبر ملی کہ انہوں نے ثریا کے منگیتر کی شادی کر دی ہے اور بہت سا جہیز لیا ہے۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی ختم ہو رہی تھی اور کاروباری تعلقات استوار ہونے لگے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کبھی کبھی کوئی نہ کوئی ہندو لاہور کی سڑکوں پر نظر آجاتا تھا مگر سکھوں کو ابھی لاہور آنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

ایک روز شام کو میں اور سعید میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ میری نظر اچانک ایک ٹیبل پر گئی۔ یہاں مجھے جانی پہچانی صورت چائے پیتی نظر آئی۔ میں نے ایک منٹ کے لئے اسے غور سے دیکھا اور پھر اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔

"نمستے بالک رام جی۔"

یہ کرسٹل ہوٹل امرتسر کا مینیجر بالک رام تھا۔ جس نے ایک طوفانی رات کو مجھے اور ثریا کو اپنے ہوٹل میں پناہ دی تھی۔ اس نے فوراً مجھے پہچان لیا۔ اٹھ کر گلے ملا اور سب گھر والوں کی خیریت پوچھی۔ میں نے اپنی سیٹ پر آنے کی دعوت دی سعید کا تعارف کروایا۔ بالک رام پہلے سے کچھ دبلا ہو گیا تھا اور سر میں کچھ سفید بال بھی آگئے تھے۔

میں نے کہا:

"آپ تو بوڑھے ہو رہے ہیں بالک رام جی! آپ کو تو جوان رہنا چاہیے تھا۔"

بالک رام مخصوص انداز میں آنکھیں سکیڑ کر ہنسا اور بولا:

"ماراج! اب وہ پہلی بات نہیں رہی، اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"وہ کیوں؟"

"بس یونہی۔۔۔۔ یوں سمجھ لیں کہ امرتسر ایک مردہ جسم ہے جس کا خون یہاں آ گیا ہے۔ بھگوان آپ کے پاکستان کو ترقی دے۔ بس اب تو یہی ایک آرزو ہے۔"

میں نے بالک رام جی کے لئے مزید چائے وغیرہ منگوائی۔۔۔۔ بالک رام نے اچانک میری طرف جھک کر برادرانہ اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ بہن جی تو خیریت سے ہیں نا، اب تو آپ لوگوں کا بیاہ بھی ہو گیا ہو گا۔ کتنے بچے ہیں۔ میں انہیں ضرور ملوں گا۔ میری یہاں ایک ہی تو بہن جی ہیں۔"

میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھوں میں لرزا ٹھی اور مجھے اچھو

آ گیا۔ میں اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا۔ میری عدم موجودگی میں سعید نے لالہ جی کو سارا قصہ سنا دیا۔

میں واپس آیا تو لالہ جی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ میری طرف ہاتھ جوڑ کر بولے:

"مجھے شما کر دیجئے ماراج، مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب آپ مجھے بتایئے کہ میں امرتسر جا کر آپ کی اور بہن جی کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

میں نے لالہ جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

"خدا کی یہی مرضی تھی لالہ جی، اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ تقدیر میں ملاپ لکھا ہو گا تو کبھی نہ کبھی بچھڑے ہوئے مل ہی جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد لالہ جی ہم سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ میں نے رات کے کھانے کی دعوت دی تو کہا کہ وہ ابھی واپس جا رہے ہیں۔

اگلے روز میں اور سعید حسب معمول بازیافتہ خواتین کے دفتر میں گئے جو اب جیل روڈ پر آ گیا تھا تو ہمیں وہاں سے خبر ملی کہ آج صبح کچھ لڑکیاں آئی ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔

سیکرٹری نے کہا:

"آپ تھوڑی دیر انتظار کریں میں ابھی آپ کو اوپر لئے چلتی ہوں۔ پھر آپ ان لڑکیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔"

میں اور سعید ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ جانے کیوں آج میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں سیکرٹری صاحبہ آ گئیں اور مجھے اپنے ساتھ دوسری منزل میں لے گئیں۔ یہاں پہلے انہوں نے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی کچھ لڑکیوں کو دکھایا جو سفید دوپٹے لئے کشیدہ کاری کر رہی تھیں۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر دوسرے پھر تیسرے اور پھر چوتھے کمرے میں لے گئیں۔

مگر ان میں ثریا کہیں نہیں تھی۔ میں مایوس ہو کر واپس ہی لوٹنے والا تھا کہ اچانک کمرے میں میری نظر ایک لڑکی پر پڑی یہ لڑکی دبلی پتلی سی تھی۔ کپڑے معمولی سے پہن رکھے تھے۔ سر پر سبز رنگ کی میلی سی چادر تھی اور وہ دروازے کی طرف پشت کئے قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔

میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ میں وہیں رک گیا۔ میں نے سیکرٹری صاحبہ کو اشارہ کیا۔ انہوں نے لڑکی کو آواز دی، لڑکی نے گردن گھما کر دیکھا۔

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

میرے سامنے ثریا کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"ثریا!"

اس لڑکی نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا!

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

میں دھک سے رہ گیا۔ یہ یقیناً ثریا تھی۔ وہی گہری گہری شربتی آنکھیں، وہی سانولا رنگ جواب بھوسلا ہو رہا تھا۔ وہی لمبی لمبی پلکیں، وہی آواز، وہی لہجہ، وہی ناک نقشہ،۔۔۔۔ یہ بالکل ثریا تھی۔ صرف پہلے سے بے حد کمزور ہو رہی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ میں اندر چلا گیا۔ میں نے ثریا کا ہاتھ تھام لیا۔

"ثریا"

"ثریا! میں خالد ہوں۔ ثریا مجھے پہچانتی کیوں نہیں؟ میں خالد ہوں، جو تمہارے ساتھ قافلے میں تھا، جس کو تم نے ایک رات سماوار میں سبز چائے بنا کر پلائی تھا۔ ثریا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم مجھے پہچانتی کیوں نہیں؟"

میں بولے جا رہا تھا اور ثریا مجھے ویران آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا سر جھکتا چلا گیا۔ پہلے اس کا جسم کانپا پھر ایک سسکی لی۔ پھر اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا اور اتنا روئی کہ اس کا سارا غم، ساری اذیت، آنسوؤں میں بہہ گئی۔ میں نے اسے اٹھایا، اسے سہارا دے کر ٹیکسی منگوالی۔ جب ہم گاڑی میں سوار ہوئے تو ثریا نے گہری پراسرار نگاہوں سے مجھے ٹکٹکی لگا کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں اس قابل ہوں؟ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ جب دوبارہ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے پژمردہ ہونٹوں پر تبسم کی باریک سی لکیر رقص کر رہی تھی جس طرح موسلا دھار بارش کے بعد بادلوں کی درز میں سے سورج کی سنہری کرن اچھل کر باہر آ جاتی ہے۔
